اربابِ بست وکشاد کی خدمت میں!

وطنِ عزیز میں ۱۸ فروری ۲۰۰۸ء کے عام انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے والی جماعتوں کی مخلوط حکومت مرکز اور چاروں صوبوں میں تشکیل پا چکی ہے۔ گزشتہ آٹھ برسوں کے دورِ آمریت کے بعد نئے جمہوری دَور کے آغاز سے عوام نے بہت کچھ امیدیں وابستہ کر لی ہیں اور لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اب شاید ان کے مسائل کا خاتمہ ہو ہی جائے گا۔ حکومت نے بھی آتے ہی تبدیلیٔ نظام کے بلند بانگ دعوے کرنا شروع کر دیے ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے تمام مسائل کا حل صرف اور صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب اس سرزمین میں خدا کا قانون نافذ کر دیا جائے کہ یہی مملکت خداداد پاکستان کا مقصدِ وجود ہے' جسے یکسر فراموش کر دیا گیا ہے۔ وطنِ عزیز کو دنیا کے نقشے پر ظہور پذیر ہوئے ساٹھ برس سے زائد کا عرصہ بیت چکا ہے' مگر ہمارے مسائل میں کمی کے بجائے ہر گزرتے لمحے اضافہ ہی ہوا ہے۔ اس کی اہم ترین وجہ یہی ہے کہ ہم نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے عطا کردہ نظامِ زندگی (دین اسلام) کو اپنانے کی بجائے انسانوں کے وضع کردہ ظلم واستحصال پر مبنی طاغوتی نظاموں کو اختیار کر رکھا ہے۔ اس لیے ہمارا بنیادی مطالبہ اور مسائل کے حل کے لیے بہترین تجویز تو یہ ہے کہ ملک میں کتاب وسنت کا نفاذ عمل میں لایا جائے کہ یہ حکومت کی اوّلین ذمہ داری بھی ہے اور قیامِ پاکستان کا مقصدِ وحید بھی۔

لیکن سابقہ تلخ تجربات کی بنا پر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ حکومت کے ہاتھوں نفاذِ اسلام کے خواب کا شرمندۂ تعبیر ہونا قریب قریب ناممکنات میں سے نظر آتا ہے کہ اس کی انتخابی مہم اور موجودہ حکمت عملی میں نفاذِ شریعت نام کی کوئی شے سرے سے موجود ہی نہیں۔ اس لیے لمبی چوڑی امیدیں باندھنے کے بجائے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے ہم نومنتخب حکومت کی خدمت میں چند ایسی تجاویز پیش کرنا چاہتے ہیں جو اس کے اُن نعروں اور وعدوں ہی سے متعلق ہیں جن کی بنا پر وہ موجودہ الیکشن میں کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہے:

(۱) آپ کی اپنی تشخیص کے مطابق پاکستانی قوم کا اس وقت سب سے بڑا مسئلہ غربت' بے روزگاری اور مہنگائی ہے۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ لوگ افلاس سے تنگ آ کر اپنے معصوم بچوں سمیت خودکشی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ ہر حکومت غربت کے خاتمے کے لیے لمبے چوڑے منصوبے تشکیل دیتی ہے' لیکن کچھ ان کے نقائص اور کچھ بدعنوانی کی بنا پر ان سے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہو پاتے۔ ہماری نظر میں اس کا آسان' قابلِ عمل اور یقینی حل یہ ہے کہ ''اسلامی نظامِ زکوٰۃ'' کو کما حقہٗ لاگو کر دیا جائے' جس سے حکومت کو نہ تو نت نئے اور بھاری بھرکم ٹیکس لگانے کی ضرورت پڑے گی اور نہ ہی غریبوں کو مصائب زندگی سے تنگ آ

کر اپنا چراغِ حیات گل کرنے کی نوبت پیش آئے گی۔ قیمتوں کے بڑھتے ہوئے رجحان کو کنٹرول کرنے اور زیادہ سے زیادہ ملازمتوں کے مواقع مہیا کرنے کے لیے بھی سنجیدہ اقدامات ازبس ناگزیر ہیں۔ مندرجہ بالا ایجابی اقدامات کے پہلو بہ پہلو کچھ سلبی نوعیت کے قدم بھی اٹھانے ہوں گے۔ ان میں سود کی لعنت کا کلی خاتمہ سرفہرست ہے۔ یہ وہ جرمِ عظیم ہے جسے قرآن کریم نے خدا اور رسولؐ سے اعلانِ جنگ قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں مختلف ممالک میں بلاسود بینکاری کے تجربات کی روشنی میں قابلِ عمل نظام وضع کیا جاسکتا ہے۔ نیز سرکاری و غیر سرکاری سطح پر اس حوالے سے کافی علمی و نظری کام کیا جاچکا ہے جس کی روشنی میں غیر سودی معیشت کو اپنانا قطعاً ناممکن نہیں رہا۔ لیکن اس کے لیے نیت کا صاف ہونا شرط ہے، ورنہ جان چھڑانے کے لیے ہزاروں بہانے موجود ہیں۔ ایک اور اہم کام کرنے کا یہ ہے کہ مختلف قسم کی دلفریب اور عیارانہ اسکیموں کے نام پر جو کروڑوں روپے کا جوا کھیلا جارہا ہے اسے بیک قلم ممنوع قرار دے دیا جائے۔ سچ یہ ہے کہ غربت، بے روزگاری اور افراطِ زر کی بنیادی ترین وجہ معاشرے میں سود اور جوئے کا وجود ہے جسے جڑ سے اکھاڑ پھینکے بغیر ایک متوازن اور صالح نظامِ معیشت کا قیام کسی طور ممکن نہیں۔

(۲) دوسرا مسئلہ امن و امان کا ہے۔ سابقہ حکومت اور موجودہ سربراہِ ریاست کی ناکام، بلکہ نامراد پالیسیوں کی بنا پر پورا ملک خاک و خون کی لپیٹ میں ہے۔ اس سے نہ سکیورٹی فورسز محفوظ ہیں نہ ملک کی اعلیٰ شخصیات سمیت سویلین افراد۔ اسی طرح قبائلی علاقوں میں مغربی آقاؤں کے ایماء پر جاری آپریشن سے بھی خطے کا چین و سکون تباہ ہوکر رہ گیا ہے۔ اس سے نمٹنے کے لیے جہاں اپنی خارجہ پالیسی پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے وہیں ملک میں موجود مقامی طالبان اور نفاذِ شریعت کے حامی مسلح افراد سے گفت و شنید کی بھی اشد ضرورت ہے۔ حکومت کا یہ اعلان قابلِ ستائش ہے کہ مقامی طالبان سے مذاکرات کیے جائیں گے۔ اسی طرح مولانا صوفی محمد کی رہائی بھی مستحسن قدم ہے۔ تاہم ان مذاکرات کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے ضروری ہے کہ ملک کے معتبر علماء کو عموماً اور قبائلی علاقوں میں اثر و رسوخ رکھنے والی مذہبی قیادت کو بطورِ خاص اس مکالمے میں لازماً شریک کیا جائے۔

(۳) ناخواندگی اور جہالت بھی ملک کو درپیش بحرانوں میں سرفہرست ہے۔ ہمارے گردوپیش موجود بے شمار معاشرتی برائیوں کی اصل جڑ معیاری تعلیم و تربیت کا فقدان ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم ضرورت تو یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو گریجویشن تک تعلیم بالکل مفت کر دی جائے۔ دوسرا قابلِ توجہ پہلو نصابِ تعلیم ہے، جس کی تنزلی کا یہ عالم ہے کہ یہود و نصاریٰ کے کہنے پر قرآن کے وہ حصے نصاب سے نکال باہر کر دیے گئے ہیں جن میں ظالموں کے ظلم کے خلاف جدوجہد کا درس دیا گیا ہے۔ ہر طرح کے دباؤ کو مسترد کرتے ہوئے نصابِ تعلیم کو مکمل اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مرتب کرنا حکومتِ وقت کا اوّلین فریضہ ہے۔ دوسری طرف صورتِ حال یہ ہے کہ ملک کے اعلیٰ سرکاری تعلیمی اداروں میں موسیقی اور پرفارمنگ آرٹ کی دیگر اصناف کی باقاعدہ تعلیم کے لیے لاکھوں روپے کے فنڈز مختص کیے جارہے ہیں جسے قرآن حکیم نے

''صوتِ شیطانی'' قرار دیا ہے۔ اس سلسلے کو فوراً ختم کرنا ہوگا کہ قرآن وسنت سے صریحاً متصادم ہونے کے ساتھ ساتھ یہ ملکی آئین کی بھی کھلی خلاف ورزی ہے جس کے مطابق ملک میں اسلامی تہذیب وثقافت پر مبنی اقدار کو فروغ دینا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ جبکہ یہ الحاد پر مبنی اباحیت پسندانہ مغربی تہذیب کی مکروہ کثافتوں میں سے ایک ہے۔

(٤) ایک مسلمان قوم وملت ہونے کے پہلو سے اگر افرادِ معاشرہ کے مجموعی اخلاق وکردار کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہماری اخلاقی قدریں تیزی سے روبہ زوال ہیں۔ ان کا ایک بہت بڑا اور بنیادی سبب میڈیا کی شتر بے مہار آزادی ہے۔ آمرانہ جبر وتسلط اور اربابِ اقتدار کی خامیوں پر تنقید اور معاشرتی اصلاح کے لیے آزادئ اظہارِ رائے کا ہونا ایسا مسلّمہ حق ہے جس میں کسی قسم کی بحث کی گنجائش نہیں' مگر فی زمانہ میڈیا کے منفی اثرات میں اِس قدر اضافہ ہو چکا ہے کہ ان پر ہمارے اخلاقی و تہذیبی نظام کی روشنی میں بعض پابندیاں ناگزیر ہو چکی ہیں۔ ہمارے سرکاری اور نجی ٹی وی چینلز سے نشر ہونے والے پروگرامز' ڈرامے اور فلمیں کئی پہلوؤں سے انتہائی تباہ کن اثرات کی حامل ہیں۔ ان سے اخلاقی وجنسی بے راہ روی پھیل رہی ہے۔ معاشرے میں فحاشی وعریانی کا عنصر روز بروز بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اسی طرح جرائم اور مار دھاڑ کی ذہنیت بھی انہی ذرائع ابلاغ سے پیدا ہو رہی ہے۔ علاوہ ازیں میڈیا نشریات کا ایک اور خطرناک وبھیانک نتیجہ' جس پر بہت کم توجہ دی جاتی ہے' یہ نکل رہا ہے کہ ہماری نئی نسل کا ایک بہت بڑا حصہ احساسِ کمتری' ذہنی پسماندگی اور مایوسی کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ جب کچی بستیوں کے بچے چمچماتی کاریں' وسیع وعریض بنگلے' رنگا رنگ لباس اور کھانے پینے کی متنوع اشیاء ٹی وی سکرین پر دیکھتے ہیں اور اُن تک رسائی نہیں پاتے تو وہ ہمیشہ کے لیے حسرت ویاس کا مجسم نمونہ بن جاتے ہیں۔ اس کے ردّعمل میں بعض تو غم غلط کرنے کے لیے منشیات جیسی لعنت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کچھ جرائم پیشہ افراد کے ہتھے چڑھ کر چوری وڈاکہ زنی کی وارداتیں شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح معاشرہ بہت سے ذہین وقابل افراد سے محروم ہو کر مجرموں کی آماج گاہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا میڈیا کے ان اثراتِ بد کے خاتمے کی خاطر حکومت کو ذرائع ابلاغ کا قبلہ بھی درست کرنا ہوگا' جس کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایسا ضابطۂ اخلاق وضع کیا جائے جس میں میڈیا کی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اقدارِ ملی کے تحفظ وفروغ کو یقینی بنایا جائے۔

اور اب کچھ گزارشات سہ ماہی ''حکمت قرآن'' سے متعلق' جس کا یہ دوسرا شمارہ ہے۔ جیسا کہ گزشتہ شمارے کے حرفِ اوّل میں لکھا گیا تھا کہ 'حکمت قرآن' نئے دَور کا آغاز کر رہا ہے' مگر یہ آغاز بتدریج ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں شمارے کو اعلیٰ علمی وتحقیقی اسلوب میں پیش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ چنانچہ جدید اسلوبِ تحقیق کے مطابق حوالہ جات وحواشی کے التزام کے ساتھ ساتھ موضوعات کے انتخاب میں بھی اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ وہ بالکل سطحی اور روایتی نوعیت کے نہ ہوں بلکہ خالصتاً علم وتحقیق پر مبنی ہونے کے ساتھ ساتھ عملی افادیت کے بھی حامل ہوں۔

● زیرِنظر شمارے میں پہلا مضمون 'بیان القرآن' کے تحت محترم صدر مؤسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب حفظہ اللہ کے دورۂ ترجمۂ قرآن پر مشتمل ہے جو کہ تسلسل سے جاری ہے۔ یہ سلسلہ عصر حاضر میں دعوت و پیغامِ قرآن کے ابلاغ میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے اور روانی و سلاست کی بنا پر ہر طبقے کے لیے اس سے مستفید ہونا انتہائی آسان ہے اور یہی اس کی اشاعت کا اصل مقصد ہے۔ تاہم 'حکمت قرآن' میں یہ اس سلسلے کا آخری درس ہے۔ آئندہ سے یہ سلسلہ اسی طرح ماہنامہ 'میثاق' میں جاری رہے گا' اِن شاء اللہ۔ اس تبدیلی کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ 'حکمت قرآن' کے سہ ماہی ہو جانے کی بنا پر اس میں وقفے کی طوالت استفادے کی راہ میں رکاوٹ بن رہی ہے' جبکہ 'میثاق' میں حسب معمول ہر ماہ شائع ہونے کی صورت میں اس سے زیادہ بہتر طور پر استفادہ کیا جا سکے گا۔ آئندہ اشاعت سے حکمت قرآن میں انگریزی سیکشن کا اضافہ زیرِغور ہے' جس میں محترم ڈاکٹر صاحب حفظہ اللہ کا انگریزی دورۂ ترجمۂ قرآن سلسلہ وار شائع کیا جائے گا' ان شاء اللہ!

● ''اہل سنت کا تصور سنت'' حافظ محمد زبیر صاحب کا تحریر کردہ ہے جس میں ایک انتہائی اہم مسئلے پر عام فہم انداز سے علمی گفتگو کی گئی ہے۔ ہمارے معاشرے کا یہ ایک المیہ ہے کہ ہر شعبۂ زندگی افراط و تفریط کا شکار ہے۔ مذہبی و دینی رُخ میں بھی غیر معتدل رجحانات پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ بعض لوگ علم و تحقیق کے نام پر سنت سے گریز و انحراف میں ایک انتہا پر ہیں تو دوسری طرف تقویٰ و تدین کی بنیاد پر اتباعِ سنت میں غلو کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے۔ زیرِنظر مضمون میں حافظ صاحب موصوف نے مؤخر الذکر رجحان کی مکمل و مسکت تردید کی ہے۔ یہ رویے دراصل جہل مرکب کا شاخسانہ ہیں کہ وحیٔ الٰہی کی حقیقی معرفت سے محرومی کے باوجود خود کو شناسائے حقیقت سمجھنے اور باور کرانے پر اصرار کیا جاتا ہے۔

● شعبہ تحقیق اسلامی سے وابستہ ہمارے رفیق جناب قاری یحییٰ اشرف عبدالغفار نے ''جماعت سازی اور اس کی بنیادیں'' میں بیعت اور اس سے متعلقہ مسائل پر اسلامی لٹریچر سے کافی مواد اکٹھا کر دیا ہے جس سے اس اہم مسئلے کے بہت سے گوشے نمایاں ہوئے ہیں اور اُمت کے معتبر اہل علم کی آراء منظر عام پر آ گئی ہیں۔ ''تصورِ بیعت'' سے متعلق مختلف نظریات میں یقیناً یہ ایک معتدل و متوازن نقطہ نظر ہے جو بہت سے اشکالات و شبہات کے ازالے کے لیے ممد و معاون ہوگا' اِن شاء اللہ!

● علاوہ ازیں معمول کا سلسلہ ''قرآن مجید کی صرفی و نحوی تشریح'' بھی شامل اشاعت ہے جو ''فہم قرآن'' کے سلسلے میں انتہائی افادیت کا حامل ہے۔ ''کتاب نما'' کے عنوان سے تبصرۂ کتب بھی موجود ہے' جس کے تحت شمارے میں اہم اور مفید کتابوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

آخر میں قارئین کرام سے درخواست ہے کہ شمارے کی بہتری کے لیے تبصرے اور تجاویز سے ہماری معاونت فرمائیں۔ نیز اہل قلم احباب سے خصوصی گزارش ہے کہ حکمت قرآنی کو عام کرنے کے لیے علمی و تحقیقی اسلوب پر مفید اور معلوماتی مضامین ارسال فرما کر اس قلمی جہاد میں ہمارے شریک سفر ہوں۔ باری تعالیٰ ہمارا حامی و ناصر ہو' آمین!

۞۞۞

سُورۃُ البقرۃ

آیات ۲۵۴ تا ۲۵۷

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا بَیۡعٌ فِیۡہِ وَلَا خُلَّۃٌ وَّلَا شَفَاعَۃٌ ؕ وَالۡکٰفِرُوۡنَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۞ اَللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۚ اَلۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ۚ لَا تَاۡخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوۡمٌ ؕ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَشۡفَعُ عِنۡدَہٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِہٖ ؕ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَمَا خَلۡفَہُمۡ ۚ وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ کُرۡسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ۚ وَلَا یَـُٔوۡدُہٗ حِفۡظُہُمَا وَہُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ ۞ لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ ۟ قَدۡ تَّبَیَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَیِّ ۚ فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَیُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَکَ بِالۡعُرۡوَۃِ الۡوُثۡقٰی ۗ لَا انۡفِصَامَ لَہَا ؕ وَاللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ۞ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۙ یُخۡرِجُہُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ؕ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَوۡلِیٰٓـئُہُمُ الطَّاغُوۡتُ ۙ یُخۡرِجُوۡنَہُمۡ مِّنَ النُّوۡرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ۞﴾

تقریباً دو رکوعوں پر مشتمل طالوت اور جالوت کی جنگ کے واقعات ہم پڑھ چکے ہیں اور اب گویا غزوۂ بدر کے لیے ذہنی اور نفسیاتی تیاری ہو رہی ہے۔ غزوات کے لیے جہاں سرفروشی کی ضرورت ہے وہاں انفاقِ مال بھی ناگزیر ہے۔ چنانچہ اب یہاں بڑے زوردار انداز میں انفاقِ مال کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' سورۃ البقرۃ کے نصف آخر میں چار مضامین تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ یعنی انفاقِ مال' قتال' عبادات اور معاملات۔ یہ گویا چار ڈوریاں ہیں جو ان بائیس رکوعوں کے اندر تانے بانے کی طرح گتھی ہوئی ہیں۔

آیت ۲۵۴ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰکُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَ یَوۡمٌ لَّا بَیۡعٌ فِیۡہِ وَلَا خُلَّۃٌ وَّلَا شَفَاعَۃٌ ؕ﴾ ''اے اہل ایمان! خرچ کرو اُس میں سے جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس سے پہلے

کہ وہ دن آ دھمکے جس میں نہ کوئی خرید وفروخت ہوگی' نہ کوئی دوستی کام آئے گی اور نہ کوئی شفاعت مفید ہوگی۔''

﴿وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ ''اور جو انکار کرنے والے ہیں وہی تو ظالم ہیں۔''

یہاں کافر سے مراد اصطلاحی کافر نہیں' بلکہ معنوی کافر ہیں' یعنی اللہ کے حکم کا انکار کرنے والے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے اس حکم انفاق کی تعمیل نہیں کرتا' دیکھتا ہے کہ دین مغلوب ہے اور اس کو غالب کرنے کی جدوجہد ہو رہی ہے' اس کے کچھ تقاضے ہیں' اس کی مالی ضرورتیں ہیں اور اللہ نے اسے مقدرت دی ہے کہ اس میں خرچ کرسکتا ہے لیکن نہیں کرتا' وہ ہے اصل کافر۔

اس کے بعد اب وہ آیت آ رہی ہے جو از روئے فرمانِ نبوی ﷺ قرآن حکیم کی عظیم ترین آیت ہے' یعنی ''آیۃ الکرسی''۔ اس کا نام بھی معروف ہے۔ میں نے آپ کو سورۃ البقرۃ میں آنے والے حکمت کے بڑے بڑے موتی اور بڑے بڑے پھول گنوائے ہیں' مثلاً آیۃ الآیات' آیۃ البر' آیۃ الاختلاف' اور اب یہ آیۃ الکرسی ہے جو توحید کے عظیم ترین خزانوں میں سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے تمام آیاتِ قرآنی کی سردار قرار دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ h سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لِكُلِّ شَيْءٍ سَنَامٌ وَاِنَّ سَنَامَ الْقُرْآنِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ ' وَفِيْهَا آيَةٌ هِيَ سَيِّدَةُ آيِ الْقُرْآنِ' هِيَ آيَةُ الْكُرْسِيِّ))(۱)

''ہر شے کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور یقیناً قرآن حکیم کی چوٹی سورۃ البقرۃ ہے' اس میں ایک آیت ہے جو آیاتِ قرآنی کی سردار ہے' یہ آیۃ الکرسی ہے۔''

جس طرح آیۃ البر اور سورۃ العصر میں ایک نسبت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور نجات کی ساری کی ساری شرائط ایک چھوٹی سی سورۃ میں جمع کر دیں: ﴿وَالْعَصْرِ ۙ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ﴾ لیکن اس کی تفصیل ایک آیت میں بیان ہوئی ہے اور وہ آیۃ البر ہے۔ چنانچہ ہم نے مطالعۂ قرآن حکیم کا جو منتخب نصاب مرتب کیا ہے اُس میں پہلا درس سورۃ العصر کا ہے اور دوسرا آیۃ البر کا ہے۔ یہی نسبت آیۃ الکرسی اور سورۃ الاخلاص میں ہے۔ سورۃ العصر ایک مختصر سی سورت ہے جبکہ آیۃ البر ایک طویل آیت ہے۔ اسی طرح سورۃ الاخلاص چار آیات پر مشتمل ایک چھوٹی سی سورت ہے اور یہ آیۃ الکرسی ایک طویل آیت ہے۔ سورۃ الاخلاص توحید کا عظیم ترین خزانہ ہے اور توحید کے موضوع پر قرآن حکیم کی جامع ترین سورت ہے' چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسے ثلثِ قرآن قرار دیا ہے' جبکہ توحید اور خاص طور پر توحید فی الصفات کے موضوع پر قرآن کریم کی عظیم ترین آیت یہ آیۃ الکرسی ہے۔

(۱) سنن الترمذی' ابواب فضائل القرآن عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء فی فضل سورۃ البقرۃ وآیۃ الکرسی۔

آیت ۲۵۵ ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ﴾ ''اللہ وہ معبود برحق ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں''۔

﴿اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ﴾ ''وہ زندہ ہے' سب کا قائم رکھنے والا ہے۔''

وہ از خود اور با خود زندہ ہے۔ اس کی زندگی مستعار نہیں ہے۔ اس کی زندگی ہماری زندگی کی مانند نہیں ہے' جس کے بارے میں بہادر شاہ ظفر نے کہا تھا ؎

عمر دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں!

اللہ تعالیٰ کی زندگی ''حیاتِ مستعار'' نہیں ہے' وہ کسی کی دی ہوئی نہیں ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی ضعف' کوئی کمزوری اور کوئی احتیاج نہیں ہے۔ وہ خود اپنی جگہ زندہ و جاوید ہستی ہے اور باقی ہر شے کا وجود اس کے حکم سے قائم ہے۔ وہ ''اَلْقَیُّوْمُ'' ہے۔ اُس کے اِذن کے بغیر کوئی شے قائم نہیں ہے۔ سورۃ الاخلاص میں اللہ تعالیٰ کے لیے دو الفاظ ''اَلْاَحَدُ'' اور ''اَلصَّمَدُ'' آئے ہیں۔ وہ اپنی جگہ ''اَلْاَحَدُ'' ہے لیکن باقی پوری کائنات کے لیے ''اَلصَّمَدُ'' ہے۔ اسی طرح وہ از خود ''اَلْحَیُّ'' ہے اور باقی پوری کائنات کے لیے ''اَلْقَیُّوْمُ'' ہے۔

﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ﴾ ''نہ اس پر اونگھ غالب آتی ہے نہ نیند۔''

﴿لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ﴾ ''جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اُسی کا ہے۔''

ہر شے کی ملکیت تامہ اور ملکیت حقیقی اُسی کی ہے۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ﴾ ''کون ہے وہ جو شفاعت کر سکے اس کے پاس کسی کی مگر اس کی اجازت سے!''

سورۃ البقرۃ میں قبل ازیں تین مرتبہ قیامت کے روز کسی شفاعت کا دوٹوک انداز میں انکار (categorical denial) کیا گیا ہے کہ کوئی شفاعت نہیں! یہاں بھی بہت ہی جلالی انداز اختیار کیا گیا ہے: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ﴾ یعنی کس کی یہ حیثیت ہے' کس کا یہ مقام ہے' کس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی حیثیت کی بنیاد پر اللہ کے حضور کسی کی شفاعت کر سکے؟ ﴿اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ﴾ ہاں' جس کے لیے اللہ اجازت دے دے۔ یہاں پہلی مرتبہ استثناء کے ساتھ شفاعت کا ذکر آیا ہے' ورنہ سورۃ البقرۃ کے چھٹے رکوع کی دوسری آیت میں ہم الفاظ پڑھ چکے ہیں: ﴿وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ ''اور نہ (اُس روز) کسی کی طرف سے کوئی شفاعت قبول کی جائے گی''۔ اسی طرح پندرہویں رکوع کی دوسری آیت میں الفاظ آئے ہیں: ﴿ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ ﴾ ''اور نہ اُس کو کسی کی شفاعت ہی فائدہ دے گی''۔ اور اب اس رکوع کی پہلی آیت میں آ چکا ہے: ﴿وَلَا شَفَاعَةٌ﴾ ''اور نہ کوئی شفاعت مفید ہوگی''۔ لیکن یہاں ایک استثناء بیان کیا جا رہا ہے کہ جس کو اللہ کی طرف سے اِذنِ شفاعت حاصل ہوگا وہ اُس کے حق میں شفاعت کر سکے گا جس کے

لیے اِذن ہوگا۔ یہ ذرا باریک مسئلہ ہے کہ شفاعت حقہ کیا ہے اور شفاعت باطلہ کیا ہے۔ دورۂ ترجمہ قرآن کے دوران اس پر تفصیل کے ساتھ بحث نہیں کی جاسکتی۔ اس پر میں اپنے تفصیلی درس ریکارڈ کرا چکا ہوں ☆۔

﴿یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَمَا خَلۡفَہُمۡ﴾ ''وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔''

عام طور پر دنیا میں ہم کسی کی سفارش کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بھئی میں اس شخص کو بہتر جانتا ہوں' اصل میں یہ جیسا کچھ نظر آتا ہے ویسا نہیں ہے' اس کے بارے میں جو معلومات آپ تک پہنچی ہیں وہ مبنی بر حقیقت نہیں ہیں' اصل حقائق کچھ اور ہیں' وہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ یہ بات اللہ کے سامنے کون کہہ سکتا ہے؟ جبکہ اللہ تو جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ اُن کے پیچھے ہے۔

﴿وَلَا یُحِیۡطُوۡنَ بِشَیۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِہٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ﴾ ''اور وہ احاطہ نہیں کر سکتے اللہ کے علم میں سے کسی شے کا بھی سوائے اس کے جو اللہ چاہے۔''

باقی ہر ایک کے پاس جو علم ہے وہ اللہ کا دیا ہوا' عطائی علم ہے۔ بڑے سے بڑے ولی' بڑے سے بڑے رسول اور بڑے سے بڑے فرشتے کا علم بھی محدود ہے۔ فرشتوں کا قول ﴿لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا﴾ ہم چوتھے رکوع میں پڑھ آئے ہیں۔

﴿وَسِعَ کُرۡسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ﴾ ''اس کی کرسی تمام آسمانوں اور زمین کو محیط ہے۔''

یہاں کرسی کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا اقتدار' اس کی قدرت اور اس کا اختیار (Authority) پوری کائنات کے اوپر حاوی ہے۔ نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اقتدار کی علامت کے طور پر واقعتاً کوئی مجسم شے بھی ہو جس کو ہم کرسی کہہ سکیں۔ اللہ تعالیٰ کے عرش اور کرسی کے بارے میں یہ دونوں باتیں ذہن میں رکھیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی کوئی مجسم حقیقت ہو جو ہمارے ذہن اور تخیل سے ماوراء ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے استعارہ مراد ہو کہ اس کا اختیار اور اقتدار آسمانوں اور زمین پر چھایا ہوا ہے۔

﴿وَلَا یَـُٔوۡدُہٗ حِفۡظُہُمَا﴾ ''اور اس پر گراں نہیں گزرتی ان دونوں کی حفاظت۔''

آسمانوں اور زمین کی حفاظت اور اِن کا تھامنا اُس پر ذرا بھی گراں نہیں اور اس سے اس پر کوئی تکان طاری نہیں ہوتی۔

﴿وَہُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ﴾ ''اور وہ بلند و بالا (اور) بڑی عظمت والا ہے۔''

☆ محترم ڈاکٹر صاحب حفظہ اللہ نے قرآن آڈیٹوریم لاہور میں ۲۳/مارچ ۱۹۹۷ء کو آیۃ الکرسی کے درس کے حوالے سے مسئلہ شفاعت پر تفصیلی روشنی ڈالی تھی۔ یہ درس ترتیب وتسوید کے بعد مئی ۲۰۰۲ء کے میثاق میں شائع ہو چکا ہے۔ (مرتب)

یہ آیۃ الکرسی ہے جو تمام آیاتِ قرآنی کی سردار اور توحیدِ الٰہی کا ایک بہت بڑا خزانہ ہے۔ اس کے بعد آنے والی دو آیات بھی حکمت اور فلسفۂ دین کے اعتبار سے بڑی عظیم آیات ہیں۔

آیت ۲۵۶ ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ﴾ ''دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔''

اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اسلام میں کسی فرد کو جبراً مسلمان بنانا حرام ہے۔ لیکن اس آیت کا یہ مطلب نکال لینا کہ نظامِ باطل کو ختم کرنے کے لیے بھی کوئی طاقت استعمال نہیں ہو سکتی' پرلے درجے کی حماقت ہے۔ نظامِ باطل ظلم پر مبنی ہے اور یہ لوگوں کا استحصال کر رہا ہے۔ یہ اللہ اور بندوں کے درمیان حجاب اور آڑ بن گیا ہے۔ لہٰذا نظامِ باطل کو طاقت کے ساتھ ختم کرنا مسلمان کا فرض ہے۔ اگر طاقت موجود نہیں ہے تو طاقت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے' لیکن جس مسلمان کا دل نظامِ باطل کو ختم کرنے کی آرزو اور ارادے سے خالی ہے اس کے دل میں ایمان نہیں ہے۔ طاقت اور جبر نظامِ باطل کو ختم کرنے پر صرف کیا جائے گا' کسی فرد کو مجبوراً مسلمان نہیں بنایا جائے گا۔ یہ ہے اصل میں اس آیت کا مفہوم۔

﴿قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ﴾ ''ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔''

جتنی بھی کجیاں ہیں' غلط راستے ہیں' شیطانی پگڈنڈیاں ہیں صراطِ مستقیم کو ان سے بالکل مبرہن کر دیا گیا ہے۔

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ﴾ ''تو جو کوئی بھی طاغوت کا انکار کرے''

دیکھئے' اللہ پر ایمان لانے سے پہلے طاغوت کا انکار ضروری ہے۔ جیسے کلمہ طیبہ ''لا الٰہ الا اللہ'' میں پہلے ہر الٰہ کی نفی ہے اور پھر اللہ کا اثبات ہے۔ طاغوت طَغٰی سے ہے' یعنی سرکش۔ تو جس نے اپنی حاکمیت کا اعلان کیا وہ طاغوت ہے' جس نے غیر اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کیا وہ بھی طاغوت ہے اور غیر اللہ کی حاکمیت کے تحت بننے والے سارے ادارے طاغوت ہیں' خواہ وہ کتنے ہی خوشنما ادارے ہوں۔ ''عدلیہ'' کے نام سے ایک ادارہ اگر اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے نہیں کر رہا' کچھ اور لوگوں کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق فیصلے کر رہا ہے تو وہ طاغوت ہے۔ ''مقننہ'' کا ادارہ اگر اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق قانون سازی نہیں کر رہا تو وہ بھی طاغوت ہے۔ جو کوئی بھی اللہ کے حدودِ بندگی سے تجاوز کرتا ہے وہ طاغوت ہے۔ دریا جب اپنی حدوں سے باہر نکلتا ہے تو یہ طغیانی ہے: ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

طغٰی اور بغٰی دونوں بڑے قریب کے الفاظ ہیں' جن کا مفہوم طغیانی اور بغاوت ہے۔ فرمایا کہ ''جو کوئی کفر کرے طاغوت کے ساتھ''۔

﴿وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ﴾ ''اور پھر اللہ پر ایمان لائے''

طاغوت سے دوستی اور اللہ پر ایمان دونوں چیزیں یکجا نہیں ہوسکتیں۔ اللہ کے دشمنوں سے بھی یارانہ ہو اور اللہ کے ساتھ وفاداری کا دعویٰ بھی ہو یہی تو منافقت ہے۔ جبکہ اسلام تو ﴿حَنِيْفًا مُّسْلِمًا﴾ کے مصداق کامل یکسوئی کے ساتھ اطاعت شعاری کا مطالبہ کرتا ہے۔

﴿فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾ ''تو اُس نے بہت مضبوط حلقہ تھام لیا۔''

جس شخص نے یہ کام کرلیا کہ طاغوت کی نفی کی اور اللہ پر ایمان لایا اس نے ایک مضبوط کنڈا تھام لیا۔ یوں سمجھئے اگر کوئی شخص سمندری جہاز کے عرشے سے سمندر میں گر جائے' اسے تیرنا بھی نہ آتا ہو اور کسی طرح ہاتھ پیر مار کر وہ جہاز کے کسی کنڈے کو تھام لے تو اب وہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی اسی سے وابستہ ہے' اب میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ وہ کنڈا اگر کمزور ہے تو اس کا سہارا نہیں بن سکے گا اور اس کے وزن سے ہی اکھڑ جائے گا یا ٹوٹ جائے گا' لیکن اگر وہ کنڈا مضبوط ہے تو وہ اس کی زندگی کا ضامن بن جائے گا۔ یہاں فرمایا کہ طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لانے والے شخص نے بہت مضبوط کنڈے پر ہاتھ ڈال دیا ہے۔

﴿لَا انْفِصَامَ لَهَا﴾ ''جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے۔''

کبھی علیحدہ ہونے والا نہیں ہے۔ یہ بہت مضبوط سہارا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ایک خطبہ میں یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں: ((وَاَوْثَقُ الْعُرٰى كَلِمَةُ التَّقْوٰى)) (۱) یعنی تمام کنڈوں میں سب سے مضبوط کنڈا تقویٰ کا کنڈا ہے۔ لہٰذا اس کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کی ضرورت ہے۔

﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ ''اور اللہ سب کچھ سننے والا سب کچھ جاننے والا ہے۔''

آیت ۲۵۷ ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اللہ ولی ہے اہل ایمان کا''

ایمان درحقیقت اللہ اور بندے کے درمیان ایک دوستی کا رشتہ قائم کرتا ہے۔ یہ ولایتِ باہمی یعنی دو طرفہ دوستی ہے۔ ایک طرف مطلوب یہ ہے کہ بندہ اللہ کا ولی بن جائے۔ ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝﴾ (یونس) ''یاد رکھو اللہ کے دوستوں کے لیے نہ تو کسی طرح کا خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور انہوں نے تقویٰ اختیار کیا''۔ دوسری طرف اللہ بھی اہل ایمان کا ولی ہے' یعنی دوست ہے' پشت پناہ ہے' مددگار ہے' کارساز ہے۔

﴿يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ ''وہ انہیں نکالتا رہتا ہے تاریکیوں سے نور کی طرف۔''

(۱) سلسلة الاحاديث الضعيفة للالبانی' ج۹ ۲۰۵' عن زيد بن خالد الجهنی۔

آپ نوٹ کریں گے کہ قرآن میں ''نُور'' ہمیشہ واحد آتا ہے۔ ''اَنوار'' کا لفظ قرآن میں نہیں آیا' اس لیے کہ نور ایک حقیقت واحدہ ہے۔ لیکن ''ظُلُمٰت'' ہمیشہ جمع میں آتا ہے' اس لیے کہ تاریکی کے shades مختلف ہیں۔ ایک بہت گہری تاریکی ہے' ایک ذرا اُس سے کم ہے' پھر اُس سے کمتر ہے۔ کفر' شرک' الحاد' مادہ پرستی' لاادریت (Agnosticism) وغیرہ مختلف قسم کی تاریکیاں ہیں۔ تو جتنے بھی غلط فلسفے ہیں' جتنے بھی غلط نظریات ہیں' جتنی بھی عمل کی غلط راہیں ہیں' ان سب کے اندھیاروں سے نکال کر اللہ اہلِ ایمان کو ایمان کی روشنی کے اندر لاتا رہتا ہے۔

﴿وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَوۡلِیٰٓـئُہُمُ الطَّاغُوۡتُ﴾ ''اور (ان کے برعکس) جنہوں نے کفر کیا' اُن کے اولیاء (پشت پناہ' ساتھی اور مددگار) طاغوت ہیں۔''

﴿یُخۡرِجُوۡنَہُمۡ مِّنَ النُّوۡرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ﴾ ''وہ ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں''۔

اگر کہیں نور کی تھوڑی بہت رمق انہیں ملی بھی تھی تو اس سے انہیں محروم کر کے انہیں تاریکیوں کی طرف دھکیلتے رہتے ہیں۔

﴿اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ۝﴾ ''یہی لوگ ہیں آگ والے' یہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔'' اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْ عِبَادِكَ الْمُؤْمِنِیْنَ' اَللّٰھُمَّ اَخْرِجْنَا مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ آمین یا ربّ العالمین!

اس کے بعد حضرت ابراہیم اور حضرت عزیر e کی زندگی کے کچھ واقعات بیان کیے جا رہے ہیں۔

آیات ۲۵۸ تا ۲۶۰

﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡ حَآجَّ اِبۡرٰہٖمَ فِیۡ رَبِّہٖۤ اَنۡ اٰتٰىہُ اللّٰہُ الۡمُلۡکَ ۘ اِذۡ قَالَ اِبۡرٰہٖمُ رَبِّیَ الَّذِیۡ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحۡیٖ وَاُمِیۡتُ ؕ قَالَ اِبۡرٰہٖمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاۡتِیۡ بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِہَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ فَبُہِتَ الَّذِیۡ کَفَرَ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ۙ﴿۲۵۸﴾ اَوۡ کَالَّذِیۡ مَرَّ عَلٰی قَرۡیَۃٍ وَّہِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوۡشِہَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحۡیٖ ہٰذِہِ اللّٰہُ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ۚ فَاَمَاتَہُ اللّٰہُ مِائَۃَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَہٗ ؕ قَالَ کَمۡ لَبِثۡتَ ؕ قَالَ لَبِثۡتُ یَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ یَوۡمٍ ؕ قَالَ بَلۡ لَّبِثۡتَ مِائَۃَ عَامٍ فَانۡظُرۡ اِلٰی طَعَامِکَ وَشَرَابِکَ لَمۡ یَتَسَنَّہۡ ۚ وَانۡظُرۡ اِلٰی حِمَارِکَ وَلِنَجۡعَلَکَ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ ۚ وَانۡظُرۡ اِلَی

الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

آیت ۲۵۸ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ﴾ ’’کیا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے حجت بازی کی تھی ابراہیمؑ سے اس وجہ سے کہ اللہ نے اسے بادشاہی دی ہوئی تھی۔‘‘

یہ بابل (عراق) کا بادشاہ نمرود تھا۔ یہ ذہن میں رکھیے کہ نمرود اصل میں لقب تھا‘ کسی کا نام نہیں تھا۔ جیسے فرعون (ج فراعنہ) مصر کے بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا اسی طرح نمرود (ج نمارده) بابل (عراق) کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ حضرت ابراہیم d کی پیدائش ’’اُر‘‘ میں ہوئی تھی جو بابل (Babylonia) کا ایک شہر تھا اور وہاں نمرود کی بادشاہت تھی۔ جیسے فرعون نے مصر میں اپنی بادشاہت اور اپنی خدائی کا دعویٰ کیا تھا اسی طرح کا دعویٰ نمرود کا بھی تھا۔ فرعون اور نمرود کا خدائی کا دعویٰ درحقیقت سیاسی بادشاہت اور اقتدار کا دعویٰ تھا کہ اختیارِ مطلق ہمارے ہاتھ میں ہے‘ ہم جس چیز کو چاہیں غلط قرار دے دیں اور جس چیز کو چاہیں صحیح قرار دے دیں۔ یہی اصل میں خدائی اختیار ہے جو انہوں نے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ تحلیل وتحریم اللہ تعالیٰ کا حق ہے‘ کسی شے کو حلال کرنے یا کسی شے کو حرام کرنے کا اختیارِ واحد اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور جس شخص نے بھی قانون سازی کا یہ اختیار اللہ کے قانون سے آزاد ہو کر اپنے ہاتھ میں لے لیا وہی طاغوت ہے‘ وہی شیطان ہے‘ وہی نمرود ہے‘ وہی فرعون ہے۔ ورنہ فرعون اور نمرود نے یہ دعویٰ تو نہیں کیا تھا کہ یہ دنیا ہم نے پیدا کی ہے۔

﴿اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ؕ﴾ ’’جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا ربّ تو وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تو اُس نے کہا کہ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔‘‘

نمرود نے جیل سے سزائے موت کے دو قیدی منگوائے‘ ان میں سے ایک کی گردن وہیں اڑا دی اور دوسرے کی سزائے موت معاف کرتے ہوئے اسے رہا کر دیا اور حضرت ابراہیم d سے کہنے لگا کہ دیکھو‘ میں نے جس کو چاہا زندہ رکھا اور جس کو چاہا مار دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے دیکھا کہ یہ کٹ حجتی پر اترا ہوا ہے‘ اسے ایسا جواب دیا جانا چاہیے جو اُس کو چپ کرا دے۔

﴿قَالَ اِبۡرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاۡتِیۡ بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِهَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ﴾ ''ابراہیمؑ نے کہا کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے (اگر تو خدائی کا مدعی ہے) تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا''

﴿فَبُهِتَ الَّذِیۡ كَفَرَ﴾ ''تو مبہوت ہو کر رہ گیا وہ کافر۔''

اب اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ یہ بات سن کر بھونچکا اور ششدر ہو کر رہ گیا۔

﴿وَاللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ﴾ ''اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔''

اللہ نے اسے راہ یاب نہیں کیا' لیکن وہ چپ ہو گیا' اُس سے حضرت ابراہیم d کی بات کا کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ اس کے بعد اس نے بُت کدے کے پجاریوں کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ ابراہیمؑ کو آگ میں جھونک دیا جائے۔

آیت ۲۵۹ ﴿اَوۡ كَالَّذِیۡ مَرَّ عَلٰی قَرۡیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوۡشِهَا﴾ ''یا پھر جیسے کہ وہ شخص (اس کا واقعہ ذرا یاد کرو) جس کا گزر ہوا ایک بستی پر اور وہ اوندھی پڑی ہوئی تھی اپنی چھتوں پر۔''

تفاسیر میں اگرچہ اس واقعے کی مختلف تعبیرات ملتی ہیں' لیکن یہ دراصل حضرت عزیر d کا واقعہ ہے جن کا گزر یروشلم شہر پر ہوا تھا جو تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ بابل (عراق) کے بادشاہ بخت نصر (Nebuchadnezzar) نے ۵۸۶ ق م میں فلسطین پر حملہ کیا تھا اور یروشلم کو تاخت و تاراج کر دیا تھا۔ اِس وقت بھی عراق اور اسرائیل کی آپس میں بدترین دشمنی ہے۔ یہ دشمنی درحقیقت ڈھائی ہزار سال پرانی ہے۔ بخت نصر کے حملے کے وقت یروشلم بارہ لاکھ کی آبادی کا شہر تھا۔ بخت نصر نے چھ لاکھ نفوس کو قتل کر دیا اور باقی چھ لاکھ کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتا ہوا قیدی بنا کر لے گیا۔ یہ لوگ ڈیڑھ سو برس تک اسیری (captivity) میں رہے ہیں اور یروشلم اجڑا رہا ہے۔ وہاں کوئی متنفس زندہ نہیں بچا تھا۔ بخت نصر نے یروشلم کو اس طرح تباہ و برباد کیا تھا کہ کوئی دو اینٹیں سلامت نہیں چھوڑیں۔ اُس نے ہیکل سلیمانی کو بھی مکمل طور پر شہید کر دیا تھا۔ یہودیوں کے مطابق ہیکل کے ایک تہہ خانے میں ''تابوتِ سکینہ'' بھی تھا اور وہاں ان کے ربائی بھی موجود تھے۔ ہیکل مسمار ہونے پر وہیں ان کی موت واقع ہوئی اور تابوتِ سکینہ بھی وہیں دفن ہو گیا۔ تو جس زمانے میں یہ بستی اجڑی ہوئی تھی' حضرت عزیر d کا اُدھر سے گزر ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہاں کوئی متنفس زندہ نہیں اور کوئی عمارت سلامت نہیں۔

﴿قَالَ اَنّٰی یُحۡیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعۡدَ مَوۡتِهَا﴾ ''اُس نے کہا کہ اللہ اس بستی کو اس کے اس طرح مردہ اور برباد ہو جانے کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟''

ان کا یہ سوال اظہارِ حیرت کی نوعیت کا تھا کہ اس طرح اُجڑی ہوئی بستی میں دوبارہ کیسے احیاء ہوسکتا ہے؟ دوبارہ کیسے اس میں لوگ آ کر آباد ہو سکتے ہیں؟ اتنی بڑی تباہی و بربادی کہ کوئی متنفس باقی نہیں' کوئی دو اینٹیں سلامت نہیں!

﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ﴾ ''تو اللہ نے اس پر موت وارد کر دی سو برس کے لیے اور پھر اس کو اٹھایا۔''

﴿قَالَ كَمْ لَبِثْتَ﴾ ''پوچھا کتنا عرصہ یہاں رہے ہو؟''

﴿قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ ''کہنے لگا ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ۔''

ان کو ایسا محسوس ہوا جیسے تھوڑی دیر کے لیے سویا تھا' شاید ایک دن یا دن کا کچھ حصہ میں یہاں رہا ہوں۔

﴿قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾ ''(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا بلکہ تم پورے سو سال اس حال میں رہے ہو''

﴿فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ﴾ ''تو ذرا تم اپنے کھانے اور اپنے مشروب کو (جو سفر میں تمہارے ساتھ تھا) دیکھو' ان کے اندر کوئی بساند پیدا نہیں ہوئی۔''

ان میں سے کوئی شے گلی سڑی نہیں' ان کے اندر کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی۔

﴿وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ﴾ ''اور (دوسری طرف) اپنے گدھے کو دیکھو (ہم اس کو کس طرح زندہ کرتے ہیں)''

حضرت عزیر d کی سواری کا گدھا اس عرصے میں بالکل ختم ہو چکا تھا' اس کی بوسیدہ ہڈیاں ہی باقی رہ گئی تھیں' گوشت گل سڑ چکا تھا۔

﴿وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ﴾ ''اور تا کہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں''

یعنی اے عزیرؑ! ہم نے تو خود تمہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنانا ہے' اس لیے ہم تمہیں اپنی یہ نشانی دکھا رہے ہیں تا کہ تمہیں دوبارہ اٹھائے جانے پر یقین کامل حاصل ہو۔

﴿وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا﴾ ''اور اب ان ہڈیوں کو دیکھو' کس طرح ہم انہیں اٹھاتے ہیں''

﴿ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا﴾ ''پھر (تمہاری نگاہوں کے سامنے) ان کو گوشت پہناتے ہیں۔''

چنانچہ حضرت عزیرؑ کے دیکھتے ہی دیکھتے ان کے گدھے کی ہڈیاں جمع ہو کر اس کا ڈھانچہ کھڑا ہو گیا اور

پھر اس پر گوشت بھی چڑھ گیا۔

﴿فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ﴾ ''پس جب اس کے سامنے یہ بات واضح ہوگئی''

حضرت عزیر d نے بچشمِ سر ایک مردہ جسم کے زندہ ہونے کا مشاہدہ کرلیا۔

﴿قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ ''وہ پکار اٹھا کہ میں نے پوری طرح جان لیا (اور مجھے یقین کامل حاصل ہوگیا) کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔''

انہیں یقین ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ اس اجڑی ہوئی بستی کو بھی دوبارہ آباد کرسکتا ہے' اس کی آبادی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

حضرت عزیر d کو بنی اسرائیل کی نشأۃِ ثانیہ (Renaissance) کے نقیب کی حیثیت حاصل ہے۔ بابل کی اسارت کے دوران یہود اخلاقی زوال کا شکار تھے۔ جب حضرت عزیر d کو اللہ تعالیٰ نے متذکرہ بالا مشاہدات کرادیے تو آپؑ نے وہاں جا کر یہود کو دین کی تعلیم دی اور ان کے اندر روحِ دین کو بیدار کیا۔ اس کے بعد ایران کے بادشاہ کیخورس ☆ (Cyrus) نے جب بابل (عراق) پر حملہ کیا تو یہودیوں کو اسارت (captivity) سے نجات دی اور انہیں دوبارہ فلسطین میں جا کر آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ اس طرح یروشلم کی تعمیر نو ہوئی اور یہ بستی ۱۳۶ سال بعد دوبارہ آباد ہوئی۔ پھر یہودیوں نے وہاں ہیکل سلیمانی دوبارہ تعمیر کیا جس کو وہ معبد ثانی (Second Temple) کہتے ہیں۔ پھر یہ ہیکل ۷۰ عیسوی میں رومن جنرل ٹائٹس کے ہاتھوں تباہ ہوگیا اور اب تک دوبارہ تعمیر نہیں ہوسکا۔ دو ہزار برس ہونے کو آئے ہیں کہ ان کا کعبہ زمین بوس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا بھر کے یہودیوں کے دلوں میں آگ سی لگی ہوئی ہے اور وہ مسجد اقصیٰ کو مسمار کر کے وہاں ہیکل سلیمانی (معبد ثالث) تعمیر کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ اس کے نقشے بھی تیار ہو چکے ہیں۔ بس کسی دن کوئی ایک دھماکہ ہوگا اور خبر آ جائے گی کہ کسی جنونی (fanatic) نے وہاں جا کر بم رکھ دیا تھا' جس کے نتیجے میں مسجد اقصیٰ شہید ہوگئی ہے۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ ایک جنونی یہودی ڈاکٹر نے مسجد الخلیل میں ۷۰ مسلمانوں کو شہید کر کے خود بھی خودکشی کر لی تھی۔ اسی طرح کوئی جنونی یہودی مسجد اقصیٰ میں بم نصب کر کے اس کو گرا دے گا اور پھر یہودی کہیں گے کہ جب مسجد مسمار ہو ہی گئی ہے تو اب ہمیں یہاں ہیکل تعمیر کرنے دیں۔ جیسے ایودھیا میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد ہندوؤں کا موقف تھا کہ جب مسجد گر ہی گئی ہے تو اب یہاں پر ہمیں رام مندر بنانے دو! بہرحال یہ حضرت عزیر d کا واقعہ تھا۔ اب اسی طرح کا ایک معاملہ حضرت ابراہیم d کا مشاہدہ ہے۔

آیت ۲۶۰ ﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی﴾ ''اور یاد کرو جبکہ ابراہیمؑ نے بھی کہا تھا پروردگار! ذرا مجھے مشاہدہ کرادے کہ تو مُردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟''

☆ کیخورس کا ذکر سورۃ الکہف میں ''ذوالقرنین'' کے نام سے آیا ہے۔

﴿قَالَ اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ﴾ ''(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا کیا تم (اس بات پر) ایمان نہیں رکھتے؟''

﴿قَالَ بَلٰی﴾ ''کہا کیوں نہیں! (ایمان تو رکھتا ہوں)''

﴿وَلٰکِنۡ لِّیَطۡمَئِنَّ قَلۡبِیۡ﴾ ''لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔''

یہ تمام انبیاءِ کرام f کا معاملہ ہے کہ انہیں عین الیقین اور حق الیقین کے درجے کا ایمان عطا کیا جاتا ہے۔ انہیں چونکہ ایمان اور یقین کی ایک ایسی بھٹی (furnace) بنانا ہوتا ہے کہ جس سے ایمان اور یقین دوسروں میں سرایت کرے، تو ان کے ایمان و یقین کے لیے ان کو ایسے مشاہدات کروا دیے جاتے ہیں کہ ایمان ان کے لیے صرف ایمان بالغیب نہیں رہتا بلکہ وہ ایمان بالشہادۃ بھی ہو جاتا ہے۔ سورۃ الانعام میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے نظامِ حکومت کا مشاہدہ کرایا تاکہ وہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو شب معراج میں آسمانوں پر لے جایا گیا کہ وہ ہر شے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ ان مشاہدات سے انبیاء کو ان ایمانی حقائق پر یقین کامل ہو جاتا ہے جن کی وہ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔ گویا وہ خود ایمان اور یقین کی ایک بھٹی بن جاتے ہیں۔

﴿قَالَ فَخُذۡ اَرۡبَعَةً مِّنَ الطَّیۡرِ فَصُرۡهُنَّ اِلَیۡکَ﴾ 'فرمایا' اچھا تو چار پرندے لے لو اور انہیں اپنے ساتھ ہلا لو'

انہیں اپنے ساتھ اس طرح مانوس کر لو کہ وہ تمہاری آواز سن کر تمہارے پاس آ جایا کریں۔

﴿ثُمَّ اجۡعَلۡ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنۡهُنَّ جُزۡءًا﴾ ''پھر اُن کے ٹکڑے کر کے ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو''

﴿ثُمَّ ادۡعُهُنَّ یَاۡتِیۡنَکَ سَعۡیًا﴾ ''پھر اُن کو پکارو تو وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔''

اس کی تفصیل میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم d نے چاروں پرندوں کے سر، دھڑ، ٹانگیں اور اُن کے پر علیحدہ علیحدہ کیے۔ پھر ایک پہاڑ پر چاروں کے سر، دوسرے پہاڑ پر چاروں کے دھڑ، تیسرے پہاڑ پر چاروں کی ٹانگیں اور چوتھے پہاڑ پر چاروں کے پر رکھ دیے۔ اس طرح انہیں مختلف اجزاء میں تقسیم کر دیا۔ پھر انہیں پکارا تو اُن کے اجزاء مجتمع ہو کر چاروں پرندے اپنی سابقہ ہیئت میں زندہ ہو کر حضرت ابراہیم d کے پاس دوڑتے ہوئے آ گئے۔

﴿وَاعۡلَمۡ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ﴾ ''اور (اس بات کو یقین کے ساتھ) جان لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے کمالِ حکمت والا ہے۔''

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۂ آل عمران (مسلسل)

آیات ۴۴ تا ۴۶

﴿ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡۢبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡہِ اِلَیۡکَ ؕ وَمَا کُنۡتَ لَدَیۡہِمۡ اِذۡ یُلۡقُوۡنَ اَقۡلَامَہُمۡ اَیُّہُمۡ یَکۡفُلُ مَرۡیَمَ ۪ وَمَا کُنۡتَ لَدَیۡہِمۡ اِذۡ یَخۡتَصِمُوۡنَ ﴿۴۴﴾ اِذۡ قَالَتِ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرۡیَمُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنۡہُ ٭ اسۡمُہُ الۡمَسِیۡحُ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ وَجِیۡہًا فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ وَمِنَ الۡمُقَرَّبِیۡنَ ﴿۴۵﴾ وَیُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الۡمَہۡدِ وَکَہۡلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۴۶﴾﴾

و ح ی

وَحَی (ض) وَحۡیًا: پوشیدہ پیغام بھیجنا' الہام کرنا۔

وَحۡیٌ (اسم ذات): پوشیدہ پیغام' الہام' وحی۔ ﴿وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّکَلِّمَہُ اللّٰہُ اِلَّا وَحۡیًا اَوۡ مِنۡ وَّرَآیِٔ حِجَابٍ اَوۡ یُرۡسِلَ رَسُوۡلًا﴾ (الشوریٰ: ۵۱) ''اور نہیں ہے کسی بشر کے لیے کہ کلام کرے اس سے اللہ مگر الہام سے یا پردے کے پیچھے سے' یا وہ بھیجے ایک پیغامبر (یعنی فرشتہ)۔''

اَوۡحٰی (افعال) اِیۡحَاءً: پوشیدہ پیغام بھیجنا' الہام کرنا۔ آیت زیر مطالعہ۔ (یہ ثلاثی مجرد کے ہم معنی ہے لیکن قرآن مجید میں یہ افعال ثلاثی مجرد سے نہیں بلکہ بابِ افعال سے آئے ہیں)۔

ک ھ ل

کَھَلَ (ف) کُھُوۡلًا: ادھیڑ عمر کا ہونا۔

كَهْلٌ :ادھیڑعمری کا زمانہ۔آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب :''ذٰلِکَ'' مبتدأ ہے'اس کی خبر''اَنْبَاءٌ'' محذوف ہے۔''مِنْ اَنْبَاءِ الْغَیْبِ'' قائم مقام خبر ہے۔''نُوْحِیْهِ'' جملہ فعلیہ ہے اور''ذٰلِکَ'' کی خبر ثانی ہے۔''اِلَیْکَ'' متعلق خبر ہے۔''اِسْمُهُ'' مبتدأ ہے اور''اَلْمَسِیْحُ'' اس کی خبر ہے' جبکہ''عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ'' بدل ہے''اَلْمَسِیْحُ'' کا۔''وَجِیْهًا'' اور ''کَهْلًا'' حال ہیں۔

ترجمہ:

ذٰلِکَ یہ	مِنْ اَنْبَآءِ الْغَیْبِ غیب کی خبروں میں سے ہے
نُوْحِیْهِ: ہم وحی کرتے ہیں اس کو	اِلَیْکَ آپ ؐ کی طرف
وَمَا کُنْتَ :اور آپ ؐ نہیں تھے	لَدَیْهِمْ :ان کے پاس
اِذْ :جب	یُلْقُوْنَ :وہ ڈالتے تھے
اَقْلَامَهُمْ :اپنے قلم	اَیُّهُمْ :(کہ) ان میں سے کون
یَکْفُلُ :کفالت کرے گا	مَرْیَمَ :مریم کی
وَمَا کُنْتَ :اور آپ ؐ نہیں تھے	لَدَیْهِمْ :ان کے پاس
اِذْ :جب	یَخْتَصِمُوْنَ:وہ لوگ ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے
اِذْ قَالَتِ :جب کہا	الْمَلٰٓئِکَةُ :فرشتوں نے
یٰمَرْیَمُ :اے مریم	اِنَّ اللّٰهَ :بے شک اللہ
یُبَشِّرُکِ بشارت دیتا ہے آپ کو	بِکَلِمَةٍ :ایک فرمان کی
مِّنْهُ :اپنی طرف سے	اسْمُهُ :اس کا نام
الْمَسِیْحُ :مسیحؑ ہے	عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ :جو عیسیٰ ابن مریم ہیں
وَجِیْهًا :بلند رتبہ ہوں گے	فِی الدُّنْیَا :دنیا میں
وَالْاٰخِرَةِ :اور آخرت میں	وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ :اور (وہ ہوں گے) مقربین میں سے
وَیُکَلِّمُ :اور وہ کلام کریں گے	النَّاسَ :لوگوں سے
فِی الْمَهْدِ: گہوارے میں	وَکَهْلًا :اور ادھیڑعمر ہوتے ہوئے

وَّمِنَ الصّٰلِحِیْنَ :اور (وہ ہوں گے) صالحین میں سے

نوٹ :یہاں حضرت عیسیٰ d کے دو معجزوں کا ذکر ہے۔ایک یہ کہ وہ گہوارے میں لوگوں سے کلام

کریں گے۔ دوسرا یہ کہ ادھیڑ عمری کی حالت میں کلام کریں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ دودھ پیتے بچے کا کلام کرنا تو معجزہ ہے' لیکن ادھیڑ عمری میں تو ہر شخص کلام کرتا ہے۔ اس کو معجزے کے طور پر بیان کرنے کا کیا مطلب ہے؟——— یہ بات سب مانتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کے عقیدہ کے مطابق پھانسی دیے جانے کے وقت اور اسلامی عقیدے کے مطابق آسمان پر اٹھائے جانے کے وقت حضرت عیسیٰ d کی عمر ۳۰ اور ۳۵ سال کے درمیان تھی۔ اس طرح وہ ادھیڑ عمر کو پہنچے ہی نہیں۔ اب یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ وہ دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں اور ادھیڑ عمر کو پہنچیں۔ اس لیے جس طرح ان کا بچپن کا کلام معجزہ تھا اسی طرح ادھیڑ عمری کا کلام بھی معجزہ ہوگا۔ (معارف القرآن سے ماخوذ)

آیات ۴۷' ۴۸

﴿قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ ؕ قَالَ کَذٰلِکِ اللّٰہُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰٓی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ﴿ وَیُعَلِّمُہُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَالتَّوْرٰىۃَ وَالْاِنْجِیْلَ ۞﴾

ترکیب : ''یُعَلِّمُہُ'' کا فاعل اس میں ''ھُوَ'' کی ضمیر ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے' جبکہ ضمیر مفعولی ''ہٗ'' حضرت عیسیٰؑ کے لیے ہے اور یہ ''یُعَلِّمُ'' کا مفعول اوّل ہے۔ ''اَلْکِتٰبَ'' سے ''وَالْاِنْجِیْلَ'' تک مفعول ثانی ہیں۔

ترجمہ:

قَالَتْ : (بی بی مریم نے) کہا	رَبِّ : اے میرے ربّ
اَنّٰی : کہاں سے	یَکُوْنُ : ہوگا
لِیْ : میرے لیے	وَلَدٌ : کوئی لڑکا
وَّ : اس حال میں کہ	لَمْ یَمْسَسْنِیْ : چھوا ہی نہیں مجھ کو
بَشَرٌ : کسی بشر نے	قَالَ : (فرشتے نے) کہا
کَذٰلِکِ اسی طرح ہی	اللّٰہُ : اللہ
یَخْلُقُ : پیدا کرتا ہے	مَا : اس کو جس کو
یَشَآءُ : وہ چاہتا ہے	اِذَا : جب کبھی
قَضٰی : وہ فیصلہ کرتا ہے	اَمْرًا : کسی کام کا
فَاِنَّمَا : تو کچھ نہیں سوائے اس کے کہ	یَقُوْلُ : وہ کہتا ہے

لَہٗ: اس سے | کُنْ: تو ہو جا

فَیَکُوْنُ: پس وہ ہو جاتا ہے | وَیُعَلِّمُہُ: اور وہ علم دے گا انؑ کو

الْکِتٰبَ: کتاب کا | وَالْحِکْمَۃَ: اور حکمت کا

وَالتَّوْرٰىۃَ: اور تورات کا | وَالْاِنْجِیْلَ: اور انجیل کا

نوٹ (۱): ’’کُنْ فَیَکُوْنُ‘‘ کا ہم لوگوں کے ذہن میں تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کوئی حکم دیتا ہے تو وہ پلک جھپکتے ہی فوراً ہو جاتا ہے‘ جبکہ ’’فَیَکُوْنُ‘‘ کا یہ مطلب نہیں ہے۔ اس کا مطلب بس اتنا ہے کہ وہ ہو جاتا ہے‘ خواہ فوری طور پر ہو یا کچھ وقت لگے۔ اب نوٹ کر لیں کہ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ عالمِ امر میں اس کے احکام کی تعمیل فوری ہوتی ہے‘ جبکہ عالمِ خلق میں تدریج کا اصول کارفرما ہے اور یہاں وقت لگتا ہے۔ مثال کے طور پر کسان جب زمین میں بیج ڈالتا ہے تو کچھ بیج نہیں پھوٹتے‘ کیونکہ انہیں حکم نہیں ملا۔ یہ وہ بیج ہیں جو ضائع ہو گئے۔ لیکن جن بیجوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہو جاتا ہے کہ ’’کُنْ‘‘ یعنی تو درخت ہو جا‘ تو ان کے اندر اس کیمیائی تبدیلی کا عمل فوری طور پر شروع ہو جاتا ہے‘ جس کے نتیجے میں بیج پھوٹتا ہے۔ یہ عالمِ امر ہے اور یہاں حکم کی تعمیل فوری ہے۔ لیکن کیمیائی تبدیلی کے نتیجے میں بیج کا پھوٹنا‘ اکھوے کا نکلنا‘ پودا بننا‘ پھر درخت بننا اور پھل آنا‘ یہ سب عالمِ خلق ہے۔ اس میں وقت لگتا ہے اور یہاں تدریج کا اصول کارفرما ہے۔

نوٹ (۲): حضرت عیسیٰ d کو تورات اور انجیل کی تعلیم دینے کا مطلب تو واضح ہے۔ لیکن یہاں ’’الکتٰب‘‘ اور ’’الحکمۃ‘‘ کی تعلیم دینے سے کیا مراد ہے‘ اس ضمن میں آراء مختلف ہیں۔ میرا ذہن شیخ الہندؒ کی رائے کو ترجیح دیتا ہے کہ کتاب وحکمت سے مراد قرآن وسنت ہے‘ کیونکہ حضرت عیسیٰؑ دوبارہ اس دنیا میں رسول اللہ ﷺ کے اُمتی کی حیثیت سے تشریف لائیں گے اور قرآن وسنت کے مطابق احکام دیں گے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ انہیں قرآن وسنت کی تعلیم بھی دی جائے۔

آیت ۴۹

﴿وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ۙ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ ۙ اَنِّیْٓ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَھَیْـَٔۃِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْہِ فَیَکُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰہِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَکْمَہَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ ۚ وَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِیْ بُیُوْتِکُمْ ۭ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴾

ط ی ن

طَانَ (ض) طَیْنًا: گارے سے دیوار لیپنا۔

طِیْنٌ (اسم ذات) :گارا۔آیت زیر مطالعہ۔

ھ ی ء

هَاءَ (ض) هَیْئَةً :خوش شکل ہونا۔

هَیْئَةٌ (اسم ذات بھی ہے) :شکل، حلیہ۔آیت زیر مطالعہ۔

هَیَّءَ (تفعیل) تَهْیِئَةً :کسی کو شکل دینا، یعنی کسی کام کا سامان مہیا کرنا، اسباب پیدا کرنا۔﴿وَیُهَیِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا﴾ (الکھف) ''اور وہ اسباب پیدا کرے گا تمہارے لیے تمہارے کام میں آسانی کے۔''

هَیِّئْ (فعل امر) :تو سامان فراہم کر، تو اسباب پیدا کر۔﴿رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا﴾ (الکھف) ''اے ہمارے ربّ! تو عطا کر ہم کو اپنے خزانے سے کچھ رحمت اور تو اسباب پیدا کر ہمارے لیے ہمارے کام میں بھلائی کی راہ کے۔''

ن ف خ

نَفَخَ (ن) نَفْخًا :پھونک مارنا۔آیت زیر مطالعہ۔

نَفْخَةٌ (اسم ذات) :پھونک۔﴿فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ﴾ (الحاقّة) ''پھر جب پھونکی جائے گی صور میں پہلی پھونک۔''

ک م ھ

كَمِهَ (س) كَمَهًا :اندھا ہونا۔

اَكْمَهُ (افعل التفضیل) :زیادہ اندھا، یعنی پیدائشی اندھا۔آیت زیر مطالعہ۔

ب ر ص

بَرِصَ (س) بَرَصًا :برص کا مریض ہونا۔

اَبْرَصُ (افعل التفضیل) :برص کا پرانا مریض، کوڑھی۔آیت زیر مطالعہ۔

ذ خ ر

ذَخَرَ (ف) ذَخْرًا :وقتِ ضرورت کے لیے جمع کرنا۔

اِدَّخَرَ (افتعال) اِدِّخَارًا :مستقبل کے لیے اہتمام سے جمع کرنا، ذخیرہ کرنا۔آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب :''رَسُوْلًا'' سے پہلے اگر ''یُبْعَثُ'' کو محذوف مانیں تو ''رَسُوْلًا'' اس کا مفعول ثانی ہے، اور اگر ''یَكُوْنُ'' کو محذوف مانیں تو ''رَسُوْلًا'' اس کی خبر ہے۔دوسری صورت زیادہ قرین قیاس ہے۔اسی طرح ''اَنِّیْ'' سے پہلے ''وَیَقُوْلُ'' محذوف ہے۔''تَدَّخِرُوْنَ'' مادہ ''ذ خ ر'' سے باب افتعال میں جمع مذکر مخاطب کا صیغہ ہے۔یہ اصلاً ''تَذْتَخِرُوْنَ'' تھا۔پھر قاعدے کے مطابق افتعال کی ''تا'' کو

''ذ'' میں تبدیل کر کے ادغام کیا تو ''تَذَّخِرُوْنَ'' ہوا' اور یہ اسی طرح استعمال ہوتا ہے۔ پھر 'ذ' کو 'د' میں تبدیل کرنا قرآن مجید کی خصوصیت ہے۔

ترجمہ:

وَرَسُوْلاً :اور (وہ ہوں گے) ایک رسول	اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ :بنواسرائیل کی طرف
اَنِّیْ :(وہ کہیں گے) کہ مَیں	قَدْ جِئْتُکُمْ :آیا ہوں تمہارے پاس
بِاٰیَةٍ :ایک نشانی کے ساتھ	مِّنْ رَّبِّکُمْ: تمہارے ربّ کی طرف سے
اَنِّیْ اَخْلُقُ :کہ مَیں بناتا ہوں	لَکُمْ:تمہارے لیے
مِّنَ الطِّیْنِ :گارے سے	کَھَیْئَةِ الطَّیْرِ :پرندوں کی شکل جیسا
فَاَنْفُخُ :پھر میں پھونکتا ہوں	فِیْهِ :اس میں
فَیَکُوْنُ:تو وہ ہو جاتا ہے	طَیْرًا :اڑنے والا
بِاِذْنِ اللّٰهِ :اللہ کی اجازت سے	وَاُبْرِئُ :اور مَیں شفا دیتا ہوں
الْاَکْمَهَ :پیدائشی اندھے کو	وَالْاَبْرَصَ :اور کوڑھی کو
وَاُحْیِ :اور مَیں زندہ کرتا ہوں	الْمَوْتٰی :مُردوں کو
بِاِذْنِ اللّٰهِ :اللہ کی اجازت سے	وَاُنَبِّئُکُمْ:اور میں بتا دیتا ہوں تم لوگوں کو
بِمَا :وہ' جو	تَاْکُلُوْنَ :تم لوگ کھاتے ہو
وَمَا :اور وہ' جو	تَدَّخِرُوْنَ :تم لوگ ذخیرہ کرتے ہو
فِیْ بُیُوْتِکُمْ :اپنے گھروں میں	اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ بے شک اس میں
لَاٰیَةً :ایک نشانی ہے	لَّکُمْ :تمہارے لیے
اِنْ کُنْتُمْ :اگر تم لوگ ہو	مُّؤْمِنِیْنَ :ایمان لانے والے

آیات ۵۰'۵۱

﴿وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰةِ وَلِاُحِلَّ لَکُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْکُمْ وَجِئْتُکُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۚ﴾

ترکیب :''مُصَدِّقًا'' حال ہے۔ ''بَیْنَ یَدَیْنَ'' میں 'یَدَیْنَ'' مضاف بنا تو نون اعرابی گر گیا اور اس کی مضاف الیہ ''یائے متکلم'' آئی تو یہ 'یَدَیْ یَ'' ہوا۔ پھر دونوں ''یا'' کا ادغام کر کے ''یَدَیَّ'' بنا۔ ''اَطِیْعُوْا'' فعل امر ہے اور ''نِ'' ضمیر مفعولی ''نِیْ'' کا نونِ وقایہ ہے۔ دیکھئے البقرۃ کی آیت ۴۰ کی ترکیب۔

ترجمہ:

وَمُصَدِّقًا: اور تصدیق کرنے والا ہوتے ہوئے	لِّمَا: اس کی جو
بَيْنَ يَدَيَّ: میرے سامنے ہے	مِنَ التَّوْرٰىةِ: تورات میں سے
وَلِاُحِلَّ: اور تاکہ مَیں حلال کروں	لَكُمْ: تمہارے لیے
بَعْضَ الَّذِيْ: اس کے کچھ کو جو	حُرِّمَ: حرام کیا گیا
عَلَيْكُمْ: تم لوگوں پر	وَجِئْتُكُمْ: اور میں آیا ہوں تمہارے پاس
بِاٰيَةٍ: ایک نشانی کے ساتھ	مِّنْ رَّبِّكُمْ: تمہارے ربّ کی طرف سے
فَاتَّقُوا: پس تم لوگ تقویٰ کرو	اللّٰهَ: اللہ کا
وَاَطِيْعُوْنِ: اور اطاعت کرو میری	اِنَّ اللّٰهَ: یقیناً اللہ
رَبِّيْ: میرا ربّ ہے	وَرَبُّكُمْ: اور تمہارا ربّ ہے
فَاعْبُدُوْهُ: پس تم لوگ بندگی کرو اس کی	هٰذَا: یہ
صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ: ایک سیدھا راستہ ہے	

نوٹ: آیات ۴۹ اور ۵۰ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ d کی بعثت صرف بنواسرائیل کے لیے تھی، تمام عالم کے لیے نہیں تھی۔ وہ کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے، بلکہ شریعت موسوی کی تجدید کے لیے آئے تھے۔ اور یہ کام انہوں نے اُس تورات سے کیا جو اُس زمانے میں یہودیوں کے پاس تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر صورت حال یہ تھی تو پھر انؑ کا بعض حرام چیزوں کو حلال کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اس ضمن میں دو آراء ہیں: ایک یہ کہ شریعت موسوی کے بعض سخت احکام میں نرمی کی، جیسے ایامِ سبت کے احکام بہت سخت تھے، جنہیں نرم کیا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ علماءِ یہود کے اختلاف، رہبانیت پسند لوگوں کے تشدد اور جہلاء کے توہم کی وجہ سے شریعت موسوی میں بعض ایسی چیزیں حرام قرار پا گئی تھیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حرام نہیں کیا تھا۔ حضرت عیسیٰ d نے اُس وقت کی موجود تورات کی سند پر ایسی چیزوں کو دوبارہ حلال کیا۔ آیت ۵۰ میں ماضی مجہول کا لفظ ''حُرِّمَ'' آیا ہے جس سے دوسری رائے کو تقویت ملتی ہے، لیکن پہلی رائے کو بھی غلط قرار دینا ممکن نہیں ہے۔ میرے خیال کے مطابق اس امکان کو بھی رد نہیں کرنا چاہیے کہ حضرت عیسیٰؑ نے مذکورہ دونوں کام کیے ہوں۔

آیات ۵۲ تا ۵۴

﴿فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا

الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ ۝﴾

ح س س

حَسَّ (ن) حَسًّا : جڑ سے اکھاڑنا' قتل کرنا۔ ﴿اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ﴾ (آل عمران:۱۵۲) ''جب تم لوگ قتل کرتے تھے ان کو اس کی اجازت سے۔''

حَسَّ (ض) حِسًّا : حواسِ خمسہ کے ذریعے کسی بات کا پتا چلنا' محسوس ہونا۔

حَسِيْسٌ (فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت) : ہلکی اور پست آواز' سرسراہٹ۔ ﴿لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا﴾ (الانبیاء:۱۰۲) ''وہ لوگ نہیں سنیں گے اس کی سرسراہٹ۔''

اَحَسَّ (افعال) اِحْسَاسًا : حواسِ خمسہ کے ذریعے پتا چلانا' احساس کرنا۔ آیت زیر مطالعہ۔

تَحَسَّسَ (تفعّل) تَحَسُّسًا : کوشش کر کے پتا چلانا' سراغ لگانا۔

تَحَسَّسْ (فعل امر) : تو سراغ لگا۔ ﴿يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَاَخِيْهِ﴾ (یوسف:۸۷) ''اے میرے بیٹو! تم لوگ جاؤ پھر سراغ لگاؤ یوسف کا اور اس کے بھائی کا۔''

م ک ر

مَكَرَ (ن) مَكْرًا : خفیہ تدبیر کرنا' چال چلنا (اچھے اور برے' دونوں مقصد کے لیے آتا ہے)۔ آیت زیر مطالعہ۔

مَكْرٌ (اسم ذات بھی ہے) : تدبیر' چال۔ ﴿وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ﴾ (فاطر:۴۳) ''اور نہیں پڑتی بری چال مگر اپنے اہل پر (یعنی چال چلنے والے پر)۔''

مَاكِرٌ (اسم الفاعل) : تدبیر کرنے والا' چال چلنے والا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترجمہ:

فَلَمَّآ : پھر جب	اَحَسَّ : احساس کیا
عِيْسٰى : عیسیٰؑ نے	مِنْهُمُ : ان لوگوں سے
الْكُفْرَ : انکار کا	قَالَ : (تو) انہوں نے کہا
مَنْ : کون	اَنْصَارِيْ : میرا مددگار ہے
اِلَى اللّٰهِ : اللہ کی طرف	قَالَ : کہا
الْحَوَارِيُّوْنَ : حواریوں نے	نَحْنُ : ہم
اَنْصَارُ اللّٰهِ : اللہ کے مددگار ہیں	اٰمَنَّا : ہم ایمان لائے
بِاللّٰهِ : اللہ پر	وَاشْهَدْ : اور آپؑ گواہی دیں

بِاَنَّا : کہ ہم
مُسْلِمُوْنَ : فرماں برداری قبول کرنے والے ہیں
رَبَّنَا : اے ہمارے ربّ
اٰمَنَّا : ہم ایمان لائے
بِمَآ : اس پر جو
اَنْزَلْتَ : تو نے اتارا
وَاتَّبَعْنَا : اور ہم نے پیروی کی
الرَّسُوْلَ : ان رسولؑ کی
فَاكْتُبْنَا : پس تو لکھ دے ہم کو
مَعَ الشّٰهِدِيْنَ : گواہی دینے والوں کے ساتھ
وَمَكَرُوْا : اور ان لوگوں نے چال چلی
وَمَكَرَ : اور تدبیر کی
اللّٰهُ : اللہ نے
وَاللّٰهُ : اور اللہ
خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ : بہترین تدبیر کرنے والا ہے

آیات ۵۵ تا ۵۷

﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۞ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۞ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾

ترکیب : ''مَرْجِعُكُمْ'' مبتدأ مؤخر ہے۔ اس کی خبر محذوف ہے اور قائم مقام خبر مقدم ہے۔ اس میں ''مَرْجِعٌ'' مصدر بھی ہوسکتا ہے اور اسم الظرف بھی۔ ہم مصدر ہونے کو ترجیح دیں گے۔ ''اُعَذِّبُ'' کا مفعول ''هُمْ'' ہے اور ''عَذَابًا شَدِيْدًا'' مفعول مطلق ہے۔ ''مِنْ نّٰصِرِيْنَ'' کا ''مِنْ'' تبعیضیہ ہے۔

ترجمہ:

اِذْ قَالَ : جب کہا
اللّٰهُ : اللہ نے
يٰعِيْسٰٓى : اے عیسیٰؑ
اِنِّىْ : بے شک میں
مُتَوَفِّيْكَ : پورا پورا لینے والا ہوں آپؑ کو
وَرَافِعُكَ : اور میں اٹھانے والا ہوں آپؑ کو
اِلَىَّ : اپنی طرف
وَمُطَهِّرُكَ : اور میں نجات دلانے والا ہوں آپؑ کو
مِنَ الَّذِيْنَ : ان لوگوں سے جنہوں نے
كَفَرُوْا : انکار کیا

وَجَاعِلُ :اور میں بنانے والا ہوں	الَّذِيْنَ :ان کو جنہوں نے
اتَّبَعُوْكَ پیروی کی آپؐ کی	فَوْقَ الَّذِيْنَ :ان سے اوپر جنہوں نے
كَفَرُوْآ :انکار کیا	اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ : قیامت کے دن تک
ثُمَّ :پھر	اِلَيَّ :میری طرف ہی
مَرْجِعُكُمْ :تم لوگوں کا لوٹنا ہے	فَاَحْكُمُ :تب میں فیصلہ کروں گا
بَيْنَكُمْ :تمہارے مابین	فِيْمَا :اس میں
كُنْتُمْ :تم لوگ	فِيْهِ :جس میں
تَخْتَلِفُوْنَ :اختلاف کرتے تھے	فَاَمَّا الَّذِيْنَ :پس وہ جنہوں نے
كَفَرُوْا :انکار کیا	فَاُعَذِّبُهُمْ :ان کو تو میں عذاب دوں گا
عَذَابًا شَدِيْدًا :ایک شدید عذاب	فِي الدُّنْيَا :دنیا میں
وَالْاٰخِرَةِ :اور آخرت میں	وَمَا لَهُمْ :اور ان کے لیے نہیں ہے
مِّنْ نّٰصِرِيْنَ :کسی قسم کا کوئی مدد کرنے والا	وَاَمَّا الَّذِيْنَ :اور وہ جو
اٰمَنُوْا :ایمان لائے	وَعَمِلُوا :اور انہوں نے عمل کیے
الصّٰلِحٰتِ :نیک	فَيُوَفِّيْهِمْ :ان کو تو وہ پورا پورا دے گا
اُجُوْرَهُمْ :ان کے اجر	وَاللّٰهُ :اور اللہ
لَا يُحِبُّ :پسند نہیں کرتا	الظّٰلِمِيْنَ :ظلم کرنے والوں کو

نوٹ :البقرۃ کی آیت ۴۰ کی لغت میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ باب تفعّل میں ''تَوَفّٰی، یَتَوَفّٰی'' کے اصلی معنی ہیں ''پورا پورا لے لینا''۔ پھر اس سے موت دینا مراد لیا جاتا ہے جو کہ اس کے مجازی معنیٰ ہیں۔ اس آیت میں لفظ ''مُتَوَفِّیْ'' آیا ہے، جو اس کا اسم الفاعل ہے۔ اس کے اصلی معنی ہیں پورا پورا لے لینے والا، اور اس کے مجازی معنی ہیں موت دینے والا۔ اس قسم کے الفاظ کے متعلق اصول یہ ہے کہ عبارت یا جملہ میں کوئی ایسا قرینہ موجود ہو کہ ایسے لفظ کے اصلی (حقیقی) معنی لینا ممکن نہ ہو، تب مجازی معنی لیے جاتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی ایسا قرینہ موجود ہو کہ مجازی معنی لینا ضروری ہو۔ اگر ان دونوں میں سے کوئی بھی صورت نہ ہو تو پھر عام طور پر لفظ کے اصلی (حقیقی) معنی ہی لیے جاتے ہیں۔

آیت زیر مطالعہ میں مذکورہ دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی صورت موجود نہیں ہے۔ اس لیے اصولاً ''مُتَوَفِّیْکَ'' کا اصلی معنی ہی لیا جانا چاہیے۔ اب یہ ایک غیر معمولی بات ہے کہ یہاں ایک ایسا قرینہ موجود ہے جس کی وجہ سے مجازی معنی لینا ممکن نہیں رہتا۔ اور وہ یہ ہے کہ ''اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ'' کے بعد ''وَرَافِعُکَ'' کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ بات بہت واضح ہے کہ لفظ ''مُتَوَفِّیْ'' کا معنیٰ مراد، یعنی صاحبِ کلام کا مطلب اگر

''موت دینے والا'' ہوتا تو پھر ''رَافِعُکَ'' کا اضافہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس اضافے نے ''مُتَوَفِّیْ'' کے مجازی معنی کے امکان کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا ہے۔

فعل ''رَفَعَ'' بھی دو معانی میں آتا ہے: (۱) جسمانی طور پر اٹھانا۔ (۲) درجات یا رتبہ کے لحاظ سے بلند کرنا۔ قرآن مجید میں اس کے مختلف صیغے اور مشتقات ۲۹ مقامات پر آئے ہیں' کہیں پہلے اور کہیں دوسرے معنی میں۔ اس ضمن میں نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ پورے قرآن مجید میں اس کے ساتھ ''اِلٰی'' کا صلہ صرف دو مقامات پر آیا ہے' ایک آیت زیر مطالعہ میں اور دوسرا سورۃ النساء کی آیت ۱۵۸ میں۔ دونوں جگہ پر یہ حضرت عیسیٰ d کے لیے آیا ہے اور دونوں جگہ ''اِلٰی'' کی نسبت اللہ کی طرف ہے۔ اس کی وجہ سے یہ امکان ختم ہو جاتا ہے کہ مذکورہ دونوں مقامات پر حضرت عیسیٰ d کے رتبہ کی بلندی کا معنی لیا جائے۔ اس لیے اس آیت کا معنیٔ مراد یہی ہے کہ حضرت عیسیٰ d کو ان کے جسم کے ساتھ اللہ نے آسمان میں اٹھایا۔

جو لوگ اس آیت میں لفظ ''مُتَوَفِّیْ'' کا مطلب ''موت دینے والا'' لیتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ اُمت کے مفسر قرآن حضرت عبداللہ بن عباس i نے بھی اس کے یہی معنی لیے ہیں۔ یہ بات درست ہے' لیکن انہوںؓ نے آیت کے معنیٔ مراد کو بھی قائم رکھا ہے۔ انہوںؓ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ''میں آپؑ کو اپنی طرف اٹھالوں گا' پھر آخر زمانہ میں آپؑ کو طبعی طور پر وفات دوں گا''۔ (درمنثور' ج ۲' ص ۳۶' منقول از معارف القرآن)۔ یعنی آیت کے الفاظ میں تقدیم و تأخیر ہے۔ پہلے ''رَافِعُکَ'' کا وقوع ہوگا اور اس کے بعد ''مُتَوَفِّیْکَ'' کا وقوع ہوگا۔ امام رازیؒ نے نشاندہی کی ہے کہ بعض مصلحتوں کے تحت قرآن کریم میں اس طرح کی تقدیم و تأخیر بکثرت آئی ہے کہ جو واقعہ بعد میں ہونے والا تھا اس کو پہلے اور پہلے ہونے والے واقعہ کو بعد میں بیان فرمایا (تفسیر کبیر' ج ۲' ص ۴۸۱' منقول از معارف القرآن)۔ آیت زیر مطالعہ میں تقدیم و تأخیر کس مصلحت سے کی گئی ہے' اس کی وضاحت معارف القرآن میں دی ہوئی ہے۔ خواہش مند حضرات وہاں سے مطالعہ کر لیں۔

اس طرح آیت زیر مطالعہ اور سورۃ النساء کی آیت ۱۵۸ نص صریح ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ d کو جسمانی طور پر آسمان میں اٹھایا ہے۔ اور حضرت ابن عباس i کی تفسیر کے مطابق حضرت عیسیٰؑ کے دنیا میں واپس آنے کی سند بھی آیت زیر مطالعہ میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ایک سو سے زائد احادیث میں مختلف پیرائے میں جو خبریں دی گئی ہیں ان کی وجہ سے حضرت عیسیٰ d کا رفع جسمانی اور ان کی واپسی ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہو جاتی ہے۔oo

عظیم ترین گناہ

مدرس: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ سُئِلَ النَّبِیُّ ﷺ عَنِ الْکَبَائِرِ‘ قَالَ: ((اَلْاِشْرَاکُ بِاللّٰہِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ)) (متفق علیہ)☆

حضرت انس h سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے کبیرہ (یعنی بڑے بڑے) گناہوں کے بارے میں دریافت کیا گیا (کہ وہ کون کون سے گناہ ہیں) تو آپ ﷺ نے فرمایا: ’’خدا کے ساتھ شرک کرنا‘ ماں باپ کی نافرمانی وایذا رسانی‘ کسی بندے کو (ناحق) قتل کرنا اور جھوٹی گواہی دینا‘‘۔

رسول اللہ ﷺ سے جب بڑے بڑے گناہوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تو جواب میں آپؐ نے یہاں چار گناہ بتائے ہیں‘ جن میں اوّل اللہ کے ساتھ شرک ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات وصفات میں بے مثل ہے‘ اس کا کوئی ثانی نہیں‘ وہی ہے جو کائنات کا خالق اور مالک ہے۔ اُسی کی مشیت ہر آن کارفرما ہے۔ رزق کی فراہمی‘ اولاد کا عطا کرنا وغیرہ سب اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہی عالم الغیب ہے‘ وہی لوگوں کی مشکلات دور کرنے والا ہے‘ صحت اور بیماری اسی کی طرف سے ہے‘ وہی معبود یکتا ہے۔ توحید باری تعالیٰ اس قدر واضح اور نمایاں ہے کہ اس کا انکار ممکن نہیں۔ اس کے باوجود جو شخص خدائی صفات کو مخلوق کے کسی فرد میں مان لے یا اللہ کی کسی صفت کو محدود تسلیم کرے تو گویا اس نے شرک کیا۔ مراسمِ عبودیت صرف اللہ کے لیے ہیں۔ صرف وہی معبود ہے۔ کائنات کا ہر فرد خواہ وہ جن ہو‘ یا فرشتہ ہو‘ یا انسان ہو اللہ کا محتاج اور اس کا بندہ ہے۔ آپ ﷺ نے شرک کو اوّل درجہ کا گناہ کبیرہ بتایا ہے‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صرف اس ایک گناہ کو ناقابلِ بخشش قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ۚ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤی اِثْمًا عَظِیْمًا ❖﴾ (النساء)

’’یقیناً اللہ تعالیٰ اِس گناہ کو تو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اُس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ جس کے لیے چاہے گا معاف فرمادے گا۔ اور جس نے اللہ تعالیٰ کا شریک مقرر کیا تو اُس نے تو بڑا

☆ صحیح البخاری‘ کتاب الشهادات‘ باب ما قیل فی شهادة الزور۔ وصحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب بیان الکبائر واکبرها۔ الفاظ صحیح بخاری کے ہیں اور صحیح مسلم میں قتل نفس کو چھوڑ کر باقی تین گناہوں کا ذکر ہے۔

بہتان باندھا‘‘۔

شرک کو اکبر الکبائر بھی کہا گیا ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شرک صرف بُت پرستی کا نام ہے‘ حالانکہ شرک وہ گناہ ہے جس کا ارتکاب اہل ایمان سے بھی ممکن ہے کہ وہ عقیدت میں غلو سے کام لیتے ہوئے انبیاء واولیاء کے اوصاف بیان کرتے ہوئے انہیں اللہ کی صفات کے ساتھ متصف کر دیتے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾(یوسف)

’’اور اُن میں سے اکثر لوگ اللہ پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ شرک بھی کرتے ہیں۔‘‘

یہی وجہ ہے کہ جب کسی نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے یہ الفاظ کہے کہ: مَاشَاءَ اللّٰهُ وَشِئْتَ ’’جو اللہ چاہے اور آپؐ چاہیں۔‘‘ تو آپ ﷺ نے ٹوک دیا اور فرمایا: ((اَجَعَلْتَنِیْ لِلّٰهِ نِدًّا؟ قُلْ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ))(۱) ’’تم نے مجھے اللہ کا شریک ٹھہرا دیا؟ صرف یہ کہو کہ جو اللہ وحدہٗ چاہے!‘‘

خوشی کے ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں چھوٹی بچیاں دَف بجاتے ہوئے غزوۂ بدر میں شہید ہونے والے اپنے بزرگوں کو خراجِ تحسین پیش کر رہی تھیں کہ ایک بچی نے یہ کہا: وَفِيْنَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِيْ غَدٍ ’’اور ہمارے درمیان وہ نبیؐ ہیں جو کل کی خبر رکھتے ہیں‘‘ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((لَا تَقُوْلِيْ هٰكَذَا وَقُوْلِيْ مَا كُنْتِ تَقُوْلِيْنَ))(۲) ’’یہ بات مت کہو‘ اور جو بات تم کہہ رہی تھی وہی کہو‘‘۔

زیر درس حدیث میں کبیرہ گناہوں کے تذکرے میں رسول اللہ ﷺ نے جس دوسرے گناہ کا ذکر کیا ہے وہ ماں باپ کی نافرمانی اور حق تلفی ہے۔ ماں باپ اولاد کی انتہائی شفقت اور محبت کے ساتھ پرورش کرتے ہیں۔ اُن کی ضروریات اور خواہشات کی تکمیل میں لگے رہتے ہیں۔ خود تکلیف برداشت کر لیتے ہیں مگر اولاد کو مشقت میں نہیں پڑنے دیتے۔ لہٰذا اخلاق کا تقاضا ہے کہ ایسے محسنوں کے احسان کا بدلہ چکانے کے لیے اولاد ہمہ تن فرمانبرداری کا رویہ اختیار کرے۔ انہیں کسی بھی طور ناراض نہ کرے‘ نہ اُن کا دل دکھائے اور نہ تکلیف دے۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے ساتھ اونچی آواز اور تلخ لہجے میں بات نہ کریں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا﴾ (بنی اسراء یل)

’’پس اِن دونوں کو اُف تک نہ کہو اور نہ ہی ان کو جھڑکو‘ بلکہ ان کے ساتھ نرمی سے بات کرو‘‘۔

آگے فرمایا گیا کہ ان کے لیے اپنے پروردگار سے رحم کی درخواست کیا کرو:

﴿وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ (بنی اسراء یل)

’’اور کہو اے میرے پروردگار! ان پر رحم فرما جیسے کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا۔‘‘

اس ضمن میں یہاں تک ہدایت کی گئی ہے کہ اگر والدین کافر اور مشرک ہوں اور تمہیں شرک پر مجبور کریں تو

بھی تم دنیا میں اُن کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا﴾ (لقمٰن:١٥)

''اور اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک کرے جس کا تیرے پاس کوئی علم نہیں (کوئی سند نہیں) تو ان کی اطاعت ہرگز نہ کر' البتہ دنیا میں ان کے ساتھ نیک برتاؤ کرتا رہ۔''

قرآن مجید میں جہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے اور شرک سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں ساتھ ہی والدین کے ساتھ حسن سلوک کی بھی تاکید کی گئی ہے' اور یہ مضمون قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے۔ ایک جگہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾(النساء:٣٦)

''اور اللہ کی عبادت کرو' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور والدین سے اچھا سلوک کیا کرو''۔

ایک اور جگہ فرمایا گیا:

﴿لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۭ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾(البقرة:٨٣)

''(بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا تھا کہ) تم لوگ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو گے اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک رکھو گے''۔

اگر کسی کو عقلِ سلیم کی دولت سے نوازا گیا ہے تو وہ یقیناً اپنے محسن کے ساتھ احسان و مروّت اور نیک سلوک کرے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو i رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان روایت کرتے ہیں کہ:

((رِضَى الرَّبِّ فِيْ رِضَى الْوَالِدِ وَسَخَطُ الرَّبِّ فِيْ سَخَطِ الْوَالِدِ))(٣)

''باپ کی رضا میں اللہ کی رضا ہے اور باپ کے غصہ میں اللہ کی ناراضگی ہے''۔

اسی طرح حضرت انس h سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ الْاُمَّهَاتِ))(٤)

''جنت ماؤں کے قدموں تلے ہے۔''

گویا ماں باپ کی خدمت' اطاعت اور خیر خواہی نہایت ضروری ہے اور ان کو ناراض کرنا اور اذیت پہنچانا گناہِ کبیرہ ہے۔

زیر درس حدیث کی رو سے تیسرا بڑا گناہ قتل ناحق ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے زندگی دی ہے اُس سے زندگی چھین لینا کسی کے لیے جائز نہیں۔ ناحق قتل کی سزا قرآن مجید میں صاف طور پر دخولِ جہنم بیان کی گئی ہے۔ الفاظ اِس طرح ہیں:

﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا﴾ (النساء)

''اور جو شخص کسی مؤمن کو قصداً مار ڈالے تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ (جلتا) رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب ہے اور اُس کی لعنت ہے اور اللہ نے ایسے شخص کے لیے بڑا سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

اسلامی تعلیمات میں تو مسلمان کو مسلمان کا بھائی قرار دیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ ہر مسلم دوسرے مسلمان بھائیوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے۔ اس کے لیے وہی پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ مشہور حدیث نبویؐ ہے کہ:

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ))(۵)

''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔''

ایک اور جگہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ))(۶)

''تم میں سے کوئی اُس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لیے وہی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔''

گویا مسلمان تو مسلمان کا بھائی ہے اور اس کے حسن سلوک کا مستحق ہے، چہ جائیکہ اس کے ساتھ بدترین سلوک کرتے ہوئے اس کی جان لے لی جائے! زندگی تو اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ کسی دوسرے کی جان لینا تو دور کی بات ہے کسی مسلمان کے لیے یہ بھی جائز نہیں کہ وہ خود اپنی زندگی ختم کر لے، یعنی خودکشی کر بیٹھے۔ قتل عمد اکبر الکبائر میں سے ہے۔ اسلام نے تو قتل خطا پر بھی سزا رکھی ہے۔ ناحق قتل کرنے والے کی سزا دنیا میں قتل ہے، البتہ قاتل سے اگر مستقبل میں اصلاحِ احوال کی توقع ہو تو معاف کرنے کو پسند کیا گیا ہے۔

اس حدیث کی رو سے چوتھا بڑا گناہ جھوٹی گواہی دینا ہے۔ جھوٹی گواہی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صحیح صورتِ حال سامنے نہ آسکے گی۔ جھوٹی گواہی کی بنیاد پر بے گناہ کو سزا مل سکتی ہے اور مجرم سزا سے بچ سکتا ہے۔ جھوٹ تو رذائل اخلاق میں سب سے بڑے گناہوں میں شمار ہوتا ہے، بلکہ یہ تو مسلمان کی شان کے خلاف ہے کہ وہ جھوٹی بات کہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يُطْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلَى الْخِلَالِ كُلِّهَا اِلَّا الْخِيَانَةَ وَالْكَذِبَ))(۷)

''مؤمن کی طبیعت اور فطرت میں ہر خصلت کی گنجائش ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے۔''

اسلام ایسی بات کرنے کی اجازت نہیں دیتا جس میں جھوٹ کا شبہ ہو۔ دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں

ہیں جن کی بدبو یا خوشبو بڑی واضح ہوتی ہے۔ اسی طرح نیکی کے کاموں میں خوشبو اور برے کاموں میں بدبو ہوتی ہے جس کو ملائکہ محسوس کرتے ہیں۔ ایسے بدبودار اعمال میں سے ایک جھوٹ بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کے جھوٹ کی بدبو کی وجہ سے اس سے ایک میل دور چلا جاتا ہے۔(۸)

جھوٹ کی برائی کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ چھوٹے بچوں کو اپنے پاس بلانے کے لیے جھوٹ موٹ کا لالچ دینے کو بھی جھوٹ کہا گیا ہے اور اسے ناپسند کیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں بچے کو جو چیز دینے کا کہا جائے وہ اسے ضرور دینی چاہیے۔ جھوٹی گواہی تو اور بھی بری ہے۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے صبح کی نماز پڑھی، جب آپ اس سے فارغ ہوئے تو ایک دم کھڑے ہو گئے اور تین مرتبہ یہ بات دہرائی کہ:

((عُدِلَتْ شَهَادَةُ الزُّوْرِ بِالشِّرْكِ بِاللّٰهِ))(۹)

''جھوٹی گواہی اللہ کے ساتھ شرک کے برابر قرار دے دی گئی ہے''۔

پھر آپؐ نے سورۃ الحج کی یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ ''اور جھوٹی باتوں (اور جھوٹی گواہی) سے بچو!''

رسول اللہ ﷺ نے کئی مواقع پر جھوٹی گواہی سے شدت کے ساتھ روکا ہے۔ ہر مؤمن کے لیے لازم ہے کہ وہ صغیرہ گناہوں سے بھی بچے اور شرک، والدین کی حق تلفی، قتل ناحق اور جھوٹی گواہی اور دروغ گوئی جیسے گناہوں سے تو کوسوں دور رہے، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ نہ بنے۔

حواشی

(۱) مسند احمد و مدارج السالکین لابن قیم ۶۰۲/۱۔ **مسند احمد** میں ''نِدًّا'' کے بجائے ''عَدْلًا'' کا لفظ ہے۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب المغازی، باب شهود الملائكة بدرا۔ **ومتعدد دیگر مقامات**۔

(۳) سنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول اللّٰہ ﷺ، باب ما جاء من الفضل فی رضا الوالدین۔

(٤) مختصر المقاصد للزرقانی : ۳٤۸۔ وضعیف الجامع الصغیر للالبانی:۲٦٦٦۔

(٥) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده۔ وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان تفاضل الاسلام وای اموره افضل۔

(٦) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب من الایمان ان یحب لاخیه ما یحب لنفسه۔وصحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی ان من خصال الایمان ان یحب لاخیه۔

(۷) مسند احمد۔

(۸) سنن الترمذی۔

(۹) سنن الترمذی، کتاب الشهادات عن رسول اللّٰہ ﷺ، باب ما جاء فی شهادة الزور۔

اہلِ سنت کا تصورِ ''سنت''

حافظ محمد زبیر

اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے بندوں کے امتحان کے لیے ان کو مختلف آزمائشوں سے دوچار کرتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کوئی نعمت ہی اس کے بندوں کے لیے فتنہ بن جاتی ہے' جیسا کہ مال اور اولاد کے بارے میں قرآن میں مذکور ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ سے علومِ حدیث وسنت کے احیاء کی جو تحریک شروع ہوئی تھی وہ مختلف اَدوار سے گزرتی رہی۔ اسی تحریک کی وجہ سے علماء نے حدیث' تاریخ اور سیرتِ رسول ﷺ وصحابہ j وغیرہ سے متعلقہ سینکڑوں کتب کے تراجم کیے تاکہ عامۃ الناس اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث' سیرت' حیاتِ صحابہؓ اور تاریخ اسلام سے واقف ہو سکیں۔ بلاشبہ علماء کا یہ کام ایک علمی اور نفع بخش کام تھا۔ لیکن جہاں ایک کام میں خیر کے پہلو ہوتے ہیں وہاں کچھ مفاسد بھی اس سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ مصادرِ اسلامیہ سے متعلق ان سینکڑوں کتب کے تراجم کا ایک بڑا نقصان جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سامنے آیا' وہ یہ ہے کہ عامۃ الناس میں بعض افراد نے ان مترجم کتب کے جزئی مطالعہ کے بعد اپنے آپ کو درجۂ اجتہاد وافتاء پر فائز سمجھا اور مفکر اسلام کی نشست سنبھالتے ہوئے اسلام کی چودہ صد سالہ علمی تاریخ وروایت کو کارِ عبث قرار دیا۔ اللہ کے رسول ﷺ کی سنت وحدیث کے حوالے سے بھی معاصر معاشروں میں ہمیں سینکڑوں ایسے افکار ونظریات نظر آتے ہیں جو کہ راہِ اعتدال سے بہت دُور ہیں' مثلاً قادیانی' نیچری' پرویزی اور جماعت المسلمین وغیرہ۔ بعض مفکرین نے ایک انتہا پر جاتے ہوئے اللہ کے رسول ﷺ کی کسی قسم کی تشریعی حیثیت ہی کو ماننے سے انکار کر دیا تو دوسری طرف ایسے گروہ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے آپؐ کے ہر ہر قول اور فعل کو یکساں درجے کا سمجھ کر شریعت سمجھ لیا۔ اس مضمون میں ہمارے پیش نظر اِس وقت دوسرے گروہ کے افراد ہیں۔ ہمارے نزدیک اگر پہلا گروہ منکرین حدیث کا ہے تو دوسرا 'غالین فی السنۃ' کا ہے۔ یہ حضرات سنت کے مسئلے میں اُس غلو میں مبتلا ہیں جس سے آپؐ نے منع کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ حج کے موقع پر فرمایا:

((وَاِیَّاکُمْ وَالْغُلُوَّ فِی الدِّیْنِ' فَاِنَّمَا اَھْلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمُ الْغُلُوُّ فِی الدِّیْنِ))

''دین میں غلو سے بچو۔ تم سے پہلی قومیں دین میں غلو کرنے کی وجہ سے ہلاک ہوگئیں''۔

امام ابن تیمیہؒ نے اس حدیث کو مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح کہا ہے(۲)۔ امام نوویؒ نے بھی اس کو

مسلم کی شرائط پر صحیح کہا ہے۔[۳] علامہ البانیؒ نے بھی اس حدیث کو صحیح کہا ہے[٤]۔

ایک مثبت رویہ تو یہ ہے کہ ایک شخص اگر حدیث کی مترجم کتابوں سے استفادہ کرتا ہے اور اس دوران اسے کچھ اشکالات پیش آتے ہیں تو وہ ﴿فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ﴾ کے قرآنی حکم کے مطابق علماء سے رجوع کر کے ان سے رہنمائی حاصل کرے۔ اگر معاصر علماء سے وہ مطمئن نہیں ہے تو ٹھوس علمی بنیادوں پر علومِ اسلامیہ کی تعلیم حاصل کرے۔ قرآن، حدیث، فقہ المقارن، اصول فقہ، اصول حدیث، اصول تفسیر، عقیدہ، علومِ بلاغت اور علومِ لغت وغیرہ میں پختگی حاصل کرے اور عربی زبان میں موجود ائمہ سلف کے علمی ذخیرے سے براہِ راست استفادہ کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص ان بنیادی دینی علوم سے ناواقف ہو اور پھر بھی دین کے معاملات میں اپنی رائے پیش کرے تو ایسے شخص کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ ایک ایسا زمانہ بھی آئے گا جس میں اللہ تعالیٰ علماء کو اٹھا لیں اور لوگوں کی صورت حال یہ ہوگی:

((اِتَّخَذَ النَّاسُ رَءُ وْسًا جُهَّالًا، فَسُئِلُوْا فَاَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ، فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا))[٥]

''لوگ جہلاء کو اپنا بڑا بنالیں گے اور ان جاہلوں سے سوال کیا جائے گا تو وہ بغیر علم کے فتوے جاری کریں گے۔ پس خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے''۔

یہ اسی زمانے کی علامات ہیں کہ علماء کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اٹھا رہے ہیں اور ترجمہ شدہ کتابوں کا جزئی طور پر مطالعہ کرنے والے فتوے جاری کرنے لگے ہیں۔ علم دین کے حصول میں سند اور استاد کی کیا اہمیت ہے، اس کی اِن شاء اللہ ایک مستقل مضمون میں وضاحت کروں گا۔ فی الحال اصل مقصود اس فکر کا جائزہ لینا ہے کہ کیا اللہ کے رسول ﷺ کا ہر ہر قول اور فعل سنت ہے یا نہیں؟

اہل سنت کے ہاں 'سنت' کی تعریف

سنت کا لغوی معنیٰ 'راستہ' یا 'طریقہ' ہے۔ ابن منظور الافریقیؒ لکھتے ہیں:

والسنة السيرة حسنة كانت أو قبيحة ... وفي الحديث : ((مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ اَجْرُهَا وَاَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً.....)) يريد من عملها ليقتدى به فيها وكل من ابتدأ أمرا عمل به قوم بعده قيل هو الذى سنه[٦]

''سنت سے مراد طریقہ ہے، چاہے اچھا ہو یا برا ہو... اور حدیث میں ہے کہ ''جس نے کوئی اچھا طریقہ جاری کیا تو اس کے لیے اس کا اجر ہے اور جس نے اس (طریقے) پر عمل کیا تو اس (جاری کرنے والے) کے لیے بھی اس کا اجر ہے۔ اور جس نے کوئی برا طریقہ جاری کیا.....'' مراد یہ ہے کہ جس نے اس برے طریقے پر عمل کیا تا کہ اس (طریقے) میں اس کی پیروی کی جائے، اور ہر وہ شخص جو کہ پہلی مرتبہ کوئی کام کرتا ہے اور اس کے بعد آنے والوں نے اس پر عمل کیا تو کہا گیا ہے کہ اس نے اسے جاری کیا''۔

علامہ زبیدیؒ لکھتے ہیں:

والسنة السيرة حسنة كانت أو قبيحة، وقال الأزهري السنة الطريقة المحمودة المستقيمة، ولذلک قيل فلان من أهل السنة، معناه من أهل الطريقة المستقيمة المحمودة(۷)

''سنت سے مراد طریقہ ہے چاہے اچھا ہو یا برا، جبکہ علامہ ازہریؒ کا قول یہ ہے کہ سنت سے مراد پسندیدہ اور سیدھا رستہ ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص 'اہل سنت' میں سے ہے، یعنی سیدھے اور پسندیدہ رستے پر ہے''۔

علامہ ابن الاثیر الجزریؒ فرماتے ہیں:

والأصل فيها الطريقة و السيرة..... وفي حديث المجوس : ((سُنُّوا بِهِمْ سُنَّةَ اَهْلِ الْكِتَابِ)) أي خذوهم على طريقهم و أجروهم في قبول الجزية منهم مجراهم(۸)

''اس کا اصل معنی طریقہ اور رستہ ہے..... مجوس کے بارے میں آپؐ کی حدیث کے الفاظ ہیں: ''ان کے بارے میں اہل کتاب کی سنت (طریقہ) جاری کرو'' یعنی ان سے بھی اہل کتاب کی طرح جزیہ وصول کرو''۔

امام راغبؒ لکھتے ہیں:

وسنة النبي ﷺ طريقته التي كان يتحراها(۹)

''سنت نبویؐ سے مراد آپؐ کا وہ طریقہ ہے کہ جس کا آپؐ قصد کرتے تھے۔''☆

امام ابن فارسؒ لکھتے ہیں:

السنة و هي السيرة و سنة رسول الله سيرته(۱۰)

''سنت کا معنی طریقہ ہے اور سنت رسول ﷺ سے مراد آپؐ کا طریقہ ہے''۔

سنت کا اصطلاحی مفہوم

فقہاء، اصولیین، محدثین اور علمائے متکلمین نے سنت کا لفظ مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ان علماء کا سنت کی تعریف میں یہ اختلاف، اختلافِ تضاد نہیں ہے بلکہ تنوع کا اختلاف ہے۔ علماء کی ہر جماعت نے اپنے میدان، موضوع اور اس کے دائرہ کار کے اعتبار سے سنت کی تعریف کی ہے اور ان میں ہر جماعت دوسری جماعت کی سنت کی تعریف کو بھی مانتی اور قبول کرتی ہے۔

☆ قصد سے امام راغبؒ کی یہاں پر مراد قربِ الٰہی کا قصد ہے، جیسا کہ بعض اصولیین نے اس کی وضاحت کی ہے۔ مراد یہ ہے کہ جو بھی کام آپؐ نے قربِ الٰہی کے قصد و ارادے سے کیا ہو وہ سنت ہے۔

متکلمین کے نزدیک سنت کا مفہوم

علم عقیدہ اور علم فقہ میں سنت کا لفظ بدعت کے بالمقابل بولا جاتا ہے۔لہٰذا عقائد وفقہ کی کتب میں جب بعض اوقات یہ بات کہی جاتی ہے کہ ''یہ عمل سنت ہے'' تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ بدعت نہیں ہے۔اسی لیے 'اہل سنت' کا لفظ 'اہل بدعت' کا متضاد ہے اور اہل سنت سے مراد وہ جماعت ہے جو کہ اہل بدعت نہیں ہیں۔الدکتور وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

وقد تطلق على ما يقابل البدعة كقولهم: فلان من أهل السنة[11]

''اور بعض اوقات (سنت) کا لفظ بدعت کے مقابلے میں استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ علماء کہتے ہیں فلاں شخص اہل سنت میں سے ہے''۔

اہل سنت کا لفظ اہل بدعت مثلاً معتزلہ'جہمیہ 'خوارج' مرجئہ' شیعہ' جبریہ اور قدریہ وغیرہ کے بالمقابل عقیدے کی ایک اصطلاح ہے۔اہل سنت سے مراد تین گروہ ہیں: اشاعرہ' ماتریدیہ اور سلفیہ یا اثریہ۔ شوافع اور مالکیہ کی اکثریت عقیدے کے اعتبار سے اشاعرہ ہیں۔اس جماعت کو امام ابوالحسن الأشعری (متوفی ۳۲۴ھ) کی طرف نسبت کی وجہ سے اشاعرہ کہا گیا۔احناف کی اکثریت ماتریدی عقائد کی حامل ہے۔یہ حضرات امام ابومنصور ماتریدی (متوفی ۳۳۳ھ) کی طرف نسبت سے اپنے آپ کو ماتریدیہ کہتے ہیں۔جبکہ حنابلہ اور اہل الحدیث (محدثین) سلفیہ یا اثریہ کہلاتے ہیں۔یہ اپنے عقائد کی نسبت سلف صالحین صحابہ' تابعین اور ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ' امام شافعی' امام مالک اور امام احمد بن حنبل n کی طرف کرتے ہیں' اس لیے یہ جماعت اپنے گروہ کو سلفیہ یا اثریہ کہتی ہے۔اہل سنت کے ان تینوں گروہوں کے عقائد میں فرق زیادہ تر صفاتِ باری تعالیٰ کے مسئلے میں ہے۔اہل سنت کے یہ تین گروہ عقائد کے باب میں ہیں' جبکہ فقہ میں اہل سنت کے گروہوں میں احناف' مالکیہ' شوافع' حنابلہ' اہل الحدیث (محدثین) اور اہل الظواہر شامل ہیں۔

فقہاء کے نزدیک سنت کی تعریف

علم الفقہ میں سنت کا لفظ فرض کے بالمقابل استعمال کیا جاتا ہے۔اور جب فقہاء کسی فعل کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ وہ سنت ہے تو اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ وہ فرض نہیں ہے۔الدکتور وھبہ الزحیلی لکھتے ہیں:

والسنة عند الفقهاء: هي ما يقابل الواجب من العبادات[12]

''فقہاء کے نزدیک سنت سے مراد وہ چیز ہے جو کہ عبادات سے متعلق ہو اور واجب (یعنی فرض) نہ ہو''۔

عام طور پر اس سنت (یعنی جو فرض نہیں ہے) کو مندوب بھی کہتے ہیں۔الدکتور عبدالکریم زیدان 'مندوب'

کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والمندوب: المدعو إليه..... وفی الاصطلاح : هو ما طلب الشارع فعله من غير الزام، بحيث يمدح فاعله و يثاب، ولا يذم تاركه، ولا يعاقب، وقد يلحقه اللوم والعتاب على ترک بعض أنواع المندوب..... والمندوب يسمى أيضا: السنة ، و النافلة، والمستحب، والتطوع، والاحسان، والفضيلة[۱۳]

''مندوب کا لغوی معنی ہے جس کی طرف بلایا جائے...اور اصطلاحی معنی میں ہر اُس کام کو مندوب کہیں گے جس کے کرنے کا شارع نے مطالبہ کیا ہو، لیکن اس کو لازم نہ ٹھہرایا ہو۔ جو شخص یہ کام کرے گا وہ قابل تعریف ہوگا اور اس کو ثواب بھی ملے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص مندوب کو چھوڑ دے گا تو نہ تو اس کو ملامت کی جائے گی اور نہ ہی اس کو سزا دی جائے گی۔ تاہم مندوب کی بعض قسمیں ایسی ہیں کہ جن کے چھوڑنے پر ملامت بھی کی جائے گی اور سزا بھی ہوگی.....مندوب کو علماء کے ہاں سنت، نفل، مستحب، تطوع، احسان اور فضیلت بھی کہتے ہیں''۔

فقہاء نے عام طور پر مندوب کو تین طرح سے تقسیم کیا ہے اور ہر قسم کا الگ الگ حکم بھی بیان کیا ہے۔ مندوب کی پہلی قسم 'سنت مؤکدہ' کہلاتی ہے۔ الدکتور عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں:

والمندوب ليس نوعا واحدا، بل هو على مراتب: فأعلاها ما واظب عليه النبیﷺ ولم يتركه إلا نادرا، و منه: صلاة ركعتين قبل فريضة الفجر، فهذه تسمى: سنة مؤكدة، يلام تاركها و لا يعاقب[۱۴]

''مندوب کی ایک قسم نہیں ہے، بلکہ اس کی کئی اقسام ہیں۔ مندوب کی سب سے اعلیٰ قسم وہ ہے جس پر اللہ کے رسولﷺ نے مداومت کی ہو اور اس کو شاذ و نادر ہی کبھی ترک کیا ہو۔ اس کی مثال فجر کی فرض نماز سے پہلے دو رکعتیں پڑھنا ہے۔ اس کو سنت مؤکدہ کہتے ہیں۔ اس کے چھوڑنے والے کو ملامت کی جائے گی لیکن اسے کوئی سزا نہیں دی جائے گی''۔

مندوب کی دوسری قسم 'سنت غیر مؤکدہ' کہلاتی ہے۔ الدکتور وھبہ الزحیلی اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وفاعله يثاب و تاركه لا يستحق عقابا ولا عتابا ولا لوما، كالأمور التی لم يواظب عليها الرسولﷺ، وإنما فعلها مرة أو أكثر وتركه، مثل صلاة أربع ركعات قبل صلاة العشاء ..... و يسمى هذا الفعل فضلا أو مستحبا[۱۵]

''اس پر عمل کرنے والے کو ثواب ہوگا اور اس پر عمل نہ کرنے والے کو نہ تو ملامت کی جائے گی اور نہ ہی دنیا و آخرت میں کوئی سزا ہوگی۔ یہ وہ فعل ہے جسے آپﷺ نے ایک یا ایک سے زائد مرتبہ کیا ہو اور اسے ترک بھی کیا ہو، مثلاً نماز عشاء سے پہلے چار رکعتیں پڑھنا.....اس قسم کو فضل یا مستحب بھی کہتے ہیں''۔

مندوب کی تیسری قسم 'مندوب زائدہ' یا 'عادت' کہلاتی ہے۔اس کو بعض علماء 'سنت زائدہ' بھی کہہ دیتے ہیں۔الدکتور وھبہ الزحیلی اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مندوب زائد: أی من الکمالیات للمکلف' کالأمور العادیة التی فعلها الرسول ﷺ بحسب العادة' کالاقتداء بأکل الرسول و شربه و اتباع طریقته فی مشیه و نو مه و لبسه ونحو ذلک ..... و یسمی هذا القسم سنة زوائد و مستحبا و أدبا و فضیلة وحکمه کما یلاحظ أن تارکه لا یستحق اللوم و العتاب' و فاعله یستحق الثواب إذا قصد به الاقتداء بالرسول ﷺ(۱۶)

''مندوب کی تیسری قسم 'مندوب زائد' ہے جو کہ مکلّف کے کمال سے متعلق ہے۔اس کی مثال وہ عادی امور ہیں جن کو آپؐ نے حسب عادت کیا۔مثلاً آپؐ کے کھانے' پینے اور آپؐ کے چلنے' سونے اور پہننے کے طریقوں وغیرہ میں آپؐ کی پیروی کرنا.....اس قسم کو سنت زائدہ' مستحب' ادب اور فضیلت بھی کہتے ہیں۔مندوب کی اس قسم کا حکم یہ ہے کہ اس کے ترک کرنے والے کو نہ ہی ملامت کی جائے گی اور نہ ہی سزا دی جائے گی اور اس پر عمل کرنے والے کو اس کا ثواب ملے گا بشرطیکہ اس کی نیت آپؐ کی اقتداء کی ہو''۔

مندوب زائد کو سنت زائدہ اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ سنت دین نہیں ہے' بلکہ دین سے زائد ہے' لیکن اگر پھر بھی کوئی شخص آپؐ کی اتباع کی نیت سے اس پر عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ آپؐ سے محبت کے اس جذبے پر اسے اجر و ثواب دیں گے۔سنت زائدہ کو دین یا شریعت اسلامیہ کا جز و سمجھنا جہالت اور غلو فی السنۃ ہے۔مندوب زائد یا سنتِ زائدہ یا آپؐ کے عادی اُمور جو کہ آپؐ نے بشری تقاضوں کے تحت سرانجام دیئے' دین اسلام کا حصہ نہیں ہیں۔آگے چل کر احادیث کے حوالے سے ہم اس موضوع پر مفصل بحث کریں گے۔الدکتور عبدلکریم زیدان لکھتے ہیں:

أنها لیست من أمور الدین' ولم تجر مجری العبادات' ولکن مجری العادات(۱۷)

''سنت زائدہ امور دین میں سے نہیں ہے اور نہ ہی سنت کی یہ قسم عبادت کے طور پر جاری ہوئی ہے' بلکہ یہ عادت کے طور پر جاری ہوئی ہے''۔

محدثین کے ہاں سنت کی تعریف

محدثین کے نزدیک سنت اور حدیث قریباً مترادف ہیں۔سنت اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال' افعال' تقریرات اور پیدائشی و اکتسابی اوصاف کا نام ہے۔جبکہ ان چاروں چیزوں کی آپؐ کی طرف نسبت حدیث کہلاتی ہے۔یعنی آپؐ کے کسی قول' فعل' تقریر یا صفت کو جب کوئی صحابیؓ اللہ کے رسول کی طرف منسوب کرتا ہے تو صحابیؓ کی آپؐ کی طرف اس نسبت کو حدیث کہتے ہیں۔سنت اگر اللہ کے رسول ﷺ

کے اقوال، افعال، تقریرات اور اوصاف کا نام ہے تو حدیث اس کی روایت ہے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سنت اور حدیث میں کچھ فرق نہیں ہے۔حدیث میں آپؐ کے اقوال، افعال، تقریرات اور اوصاف کے حوالے سے جو کچھ بیان ہو رہا ہے وہ سنت ہے۔یہی وجہ ہے کہ حدیث کی امہات الکتب میں سے اکثر کے نام سنن سے شروع ہوتے ہیں، مثلاً سنن ابی داؤد، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ وغیرہ۔سنت اور حدیث میں ایک فرق یہ ہے کہ حدیث کا لفظ سنت کی نسبت عام ہے، کیونکہ حدیث کا مقصود آپؐ کی زندگی سے متعلق جمیع حالات، واقعات، اقوال اور افعال وغیرہ کو جمع کرنا ہے چاہے وہ بعثت سے پہلے آپؐ سے صادر ہوں یا بعثت کے بعد ہوں۔جبکہ سنت صرف آپؐ کے ان اقوال و افعال و تقریرات وغیرہ پر مشتمل ہوگی جو کہ آپؐ سے بطور شریعت صادر ہوں۔اس پہلو سے غالب وصف کا اعتبار کرتے ہوئے احادیث کی کتب کو سنن کہا گیا ہے۔الدکتور رحمزۃ المليباری سنت و حدیث کے اس باریک فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

السنة فی الاصطلاح ما هو عن رسول اللهﷺ علی وجه التشريع من قول أو فعل أو تقرير أو صفة خلقية من مبدأ بعثته إلى وفاته، الحديث النبوی ما أضيف إلى النبیﷺ من قول أو فعل أو تقرير أو صفة خلقية أو خلقية سواء قبل البعثة أم بعدها سواء صدر علی وجه التشريع أم لا و يطلق تجوزا علی ما أضيف إلى الصحابة والتابعين وعليه يكون الحديث أعم من السنة فان السنة لا تشمل إلا ما صدر عن النبیﷺ علی وجه التشريع(۱۸)

''اصطلاح میں سنت سے مراد ہر وہ قول یا فعل یا تقریر یا اکتسابی وصف ہے جو کہ رسول اللہﷺ سے آپؐ کی بعثت کے بعد سے لے کر وفات تک کے دورانیے میں بطور شریعت صادر ہوا ہو۔جبکہ حدیث نبویؐ سے مراد ہر وہ قول، فعل، تقریر، پیدائشی یا اکتسابی وصف ہے کہ جس کی نسبت نبی کریمﷺ کی طرف کی گئی ہو، چاہے یہ بعثت سے پہلے ہو یا بعد میں ہو، چاہے بطور شریعت صادر ہوا ہو یا شریعت نہ ہو۔مجازاً اس کا اطلاق صحابہؓ اور تابعینؒ کے اقوال، افعال، تقریرات اور اوصاف پر بھی ہو جاتا ہے۔پس اس پہلو سے حدیث، سنت کی نسبت عام ہے، کیونکہ سنت سے مراد صرف وہی امور ہیں جو نبی کریمﷺ سے بطورِ شریعت صادر ہوئے ہوں''۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ہر حدیث شریعت نہیں ہے۔مثلاً وہ احادیث جو آپؐ کی نبوت سے ماقبل کی زندگی کے حالات و افعال پر مشتمل ہیں یا آپؐ کے پیدائشی اوصاف کو بیان کرنے والی ہیں وغیرہ۔جن احادیث کا تعلق شریعت سے ہے وہ سنت ہیں۔اسی لیے جب بھی شریعتِ اسلامیہ کے مصادر کی بات کی جاتی ہے تو قرآن و سنت کہا جاتا ہے نہ کہ قرآن و حدیث۔دوسری اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ آپﷺ کا ہر قول یا فعل سنت نہیں ہے بلکہ وہی اقوال و افعال سنن ہیں جو کہ بطور شریعت آپؐ سے صادر ہوئے ہیں۔اس موضوع پر ہم آگے چل کر مفصل بحث کریں گے۔

اصولیین کے نزدیک سنت کی تعریف

اصولیین کے نزدیک سنت کی تعریف میں الدکتور عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں:

وفی اصطلاح الأصولیین' السنة: ما صدر عن النبیﷺ' غیر القرآن' من قول أو فعل أو تقریر' فهی بهذا الاعتبار دلیل من أدلة الأحکام' و مصدر من مصادر التشریع(۱۹)

''اصولیین کی اصطلاح میں قرآن کے علاوہ رسول اللہﷺ سے جو بھی اقوال' افعال اور تقریرات صادر ہوئی ہیں وہ سنت ہیں۔ پس سنت اس اعتبار سے ادلۂ احکام میں سے ایک دلیل ہے اور مصادر شریعت میں سے ایک مصدر ہے''۔

اصولیین کا اصل موضوع یہ ہے کہ کیا چیز شریعت ہے اور کیا چیز شریعت نہیں ہے۔ اس لیے اصولیین نے آپﷺ کی صفات کو سنت کی تعریف میں شامل نہیں کیا' کیونکہ اصولیین کے نزدیک آپؐ کے پیدائشی یا اکتسابی اوصاف سے کوئی حکم شرعی مستنبط نہیں ہوتا' جبکہ محدثین کے نزدیک آپؐ کے اکتسابی اوصاف سے بھی کوئی شرعی حکم نکل سکتا ہے' لہٰذا انہوں نے اکتسابی اوصاف کو بھی سنت کی تعریف میں داخل کر دیا ہے۔ فقہاء کے مختلف طبقات نے مختلف پہلوؤں سے سنت کے معنی و مفہوم پر روشنی ڈالی ہے اور اِن معانی میں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں' کوئی تضاد نہیں۔ فقہاء' محدثین اور اصولیین کے نزدیک سنت کا اطلاق صرف انہی امور پر ہوگا جو کہ آپﷺ سے بطور شریعت صادر ہوئے ہیں۔

ہمارے بعض دوستوں کا یہ خیال ہے' جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں' کہ اللہ کے رسولﷺ کا ہر قول و فعل سنت ہے' لہٰذا اس کی پیروی کرنی چاہیے' کیونکہ قرآن میں ہمیں آپؐ کی اطاعت اور اتباع کا حکم دیا گیا ہے۔ کیا آپﷺ کا ہر قول اور فعل سنت ہے اور ہمارے لیے قابل تقلید نمونہ ہے؟ ہم اس سوال کا جواب براہ راست احادیث' صحابہؓ اور تابعینؒ کے طرز عمل میں تلاش کریں گے۔ ہم یہاں پر محدثین اور اصولیین کی اصطلاح کے اعتبار سے اپنی بحث کو آگے بڑھائیں گے اور یہ واضح کریں گے کہ آپﷺ کے اقوال' افعال اور تقریرات وغیرہ میں کیا سنت (یعنی شریعت) ہے اور کیا سنت (یعنی شریعت) نہیں ہے۔

اللہ کے رسولﷺ کے اقوال

اللہ کے نبیﷺ کے اقوال کی حیثیت سے اصولی طور پر یہ بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ آپﷺ کا ہر قول شریعت ہے بشرطیکہ وہ تشریع کے لیے آپؐ سے صادر ہوا ہو۔ کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝﴾ (النجم)

''اور وہ (نبیﷺ) اپنی خواہش نفس سے کلام نہیں کرتے۔ (اور جو بھی وہ کلام کرتے ہیں) وہ وحی ہی ہوتی ہے جو کہ وحی کی جاتی ہے''۔

حضرت عبداللہ بن عمرو i سے مروی ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

كُنتُ اَكْتُبُ كُلَّ شَیْءٍ اَسْمَعُهُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اُرِيْدُ حِفْظَهُ فَنَهَتْنِیْ قُرَيْشٌ وَقَالُوْا اَتَكْتُبُ كُلَّ شَیْءٍ تَسْمَعُهُ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَشَرٌ يَتَكَلَّمُ فِی الْغَضَبِ وَالرِّضَا، فَاَمْسَكْتُ عَنِ الْكِتَابِ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَأَوْمَأَ بِأُصْبُعِهٖ إِلٰی فِيْهِ فَقَالَ: ((اُكْتُبْ فَوَ الَّذِیْ نَفْسِیْ بِيَدِهٖ مَا يَخْرُجُ مِنْهُ إِلَّا حَقٌّ)) (۲۰)

''میں اللہ کے رسول ﷺ سے سنی ہوئی ہر بات لکھا کرتا تھا جس کو یاد رکھنے کا میرا ارادہ ہوتا تھا تو قریش کے بعض افراد نے مجھے ہر بات لکھنے سے منع کیا اور کہا: کیا جو بھی تم اللہ کے رسول ﷺ سے سنتے ہو، اسے لکھ لیتے ہو؟ حالانکہ اللہ کے رسول ﷺ ایک بشر ہیں، بعض اوقات آپ ناراضگی میں کلام فرماتے ہیں اور بعض اوقات رضامندی کی حالت میں۔ (حضرت عبداللہ بن عمروؓ کہتے ہیں کہ) میں ان صحابہؓ کی یہ بات سن کر اپنے اس فعل سے رک گیا، لیکن میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے اس بات کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے اپنے دہن مبارک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''لکھو! اللہ کی قسم اِس زبان سے سوائے حق کے کچھ نہیں نکلتا۔''

امام ابن حجرؒ نے اس حدیث کو قابل احتجاج قرار دیا ہے۔ (۲۱) علامہ البانیؒ نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ (۲۲)

قرآن کی مذکورہ بالا آیت اور اس قسم کی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے جو کلام بھی شرع بیان کرنے کے لیے کیا ہے وہ حق ہے، حجت ہے، وحی ہے اور قابل اتباع ہے۔ لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ آپ ﷺ کا ہر قول کسی شرعی حکم کو بیان کرنے کے لیے نہیں ہوتا تھا۔ بعض اوقات آپؐ ہماری طرح دنیاوی اُمور میں بھی گفتگو کرتے تھے اور آپ ﷺ کا یہ کلام کسی شرعی حکم کے استنباط کے لیے مصدر کی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ الدکتور عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں:

وأقوال النبی ﷺ إنما تکون مصدرا للتشریع، إذا کان المقصود بها بیان الأحکام أو تشریعها، أما إذا کانت فی أمور دنیویة بحته لا علاقة لها بالتشریع، ولا مبنیة علی الوحی، فلا تکون دلیلا من أدلة الأحکام، و لا مصدرا تستنبط منه الأحکام الشرعیة، و لا یلزم اتباعها، ومن ذلک ما روی: أنه علیه السلام رأی قوما فی المدینة یؤبرون النخل، فأشار علیهم بترکه، ففسد الثمر، فقال لهم: ((اَبِّرُوْا، اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ)) (۲۳)

''اللہ کے نبی ﷺ کے اقوال صرف اُس وقت مصدرِ شریعت ہوں گے جب ان سے آپؐ کا مقصود احکامِ شرعیہ کو بیان کرنا ہو۔ لیکن اگر آپؐ نے بعض دنیاوی امور کے بارے میں کچھ گفتگو ایسی فرمائی

جس کا شریعت سے کوئی تعلق نہ ہو تو آپ ﷺ کا ایسا کلام احکامِ شرعیہ کے لیے کوئی دلیل نہیں بنے گا اور نہ ہی وہ مصدر شریعت ہوگا کہ جس سے احکام نکالے جائیں' اور نہ ہی آپؐ کے ایسے اقوال کی پیروی لازمی ہے۔اس کی ایک مثال یہ روایت ہے کہ آپ ﷺ نے مدینہ کے بعض لوگوں کو دیکھا کہ وہ نر کھجور کے ساتھ مادہ کھجور کی پیوندکاری کرتے تھے۔آپؐ نے لوگوں کو ایسا کرنے سے اشارتاً منع کر دیا جس کہ وجہ سے اگلی فصل کم ہوئی تو آپؐ نے صحابہؓ کو حکم دیا کہ:''پیوندکاری کرو' کیونکہ دنیاوی امور کو تم زیادہ بہتر جانتے ہو''۔

اس موضوع پر کہ''آپؐ کا ہر قول ہمارے لیے شریعت نہیں ہے'' شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب 'حجۃ اللہ البالغۃ' میں 'المبحث السابع: مبحث استنباط الشرائع من حديث النبی ﷺ' کے تحت مختصر لیکن بہت عمدہ بحث کی ہے۔شاہ صاحبؒ کے نزدیک آپؐ کے وہ اقوال جو تبلیغِ رسالت کے باب سے نہیں ہیں (یعنی دنیاوی امور سے متعلق ہیں)' بعض حضرات کے مناقب سے متعلق اقوال' طب سے متعلق بعض اقوال' آپؐ کے دور میں کسی جزئی مصلحت کے حصول کے لیے آپؐ کے جاری کردہ احکامات' آپؐ کے عادی امور' آپؐ کے فیصلے (یعنی قضاء) اور آپؐ کے بعض احکامات کا آپؐ کی قوم کے بعض لوگوں کے لیے خاص ہونا وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔شاہ صاحبؒ نے اس موقف کی دلیل کے طور پر کہ آپؐ کا ہر قول ہمارے لیے شریعت نہیں ہے' ایک حدیث کو بیان کیا ہے۔حضرت خارجہ بن زید بن ثابتؓ سے روایت ہے:

دَخَلَ نَفَرٌ عَلٰى زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ فَقَالُوْا حَدِّثْنَا بَعْضَ حَدِيْثِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ وَمَا أُحَدِّثُكُمْ؟ كُنْتُ جَارُهُ فَكَانَ إِذَا نَزَلَ الْوَحْيُ أَرْسَلَ إِلَيَّ فَكَتَبْتُ الْوَحْيَ وَكَانَ إِذَا ذَكَرْنَا الْآخِرَةَ ذَكَرَهَا مَعَنَا وَإِذَا ذَكَرْنَا الدُّنْيَا ذَكَرَهَا مَعَنَا وَإِذَا ذَكَرْنَا الطَّعَامَ ذَكَرَهُ مَعَنَا' فَكُلُّ هٰذَا أُحَدِّثُكُمْ عَنْهُ؟ (٢٤)

''لوگوں کی ایک جماعت حضرت زید بن ثابتؓ کے پاس آئی اور انہوں نے کہا: آپ ہمیں اللہ کے رسول ﷺ کی بعض حدیثیں بیان کریں' تو حضرت زیدؓ نے کہا: میں تمہارے سامنے کون سی حدیثیں بیان کروں؟ میں اللہ کے رسول ﷺ کے پڑوس میں رہتا تھا۔پس جب وحی نازل ہوتی تھی تو آپؐ مجھے بلوا لیتے اور میں اس وحی کو لکھ لیتا تھا اور (اللہ کے رسول ﷺ کا معاملہ یہ تھا کہ) جب ہم آخرت کا تذکرہ کرتے تو آپؐ بھی ہمارے ساتھ آخرت کی باتیں کرتے تھے اور جب ہم دنیا کا ذکر کرتے تو آپؐ بھی ہمارے ساتھ دنیا کی باتیں کرنے لگتے' اور جب ہم کھانے پینے کے بارے میں گفتگو کرتے تو آپؐ بھی ہمارے ساتھ کھانے پینے کی باتوں میں شریک ہو جاتے۔پس کیا میں یہ سب حدیثیں تم سے بیان کروں؟''

امام ہیثمیؒ نے اس روایت کو 'حسن' کہا ہے۔(٢٥) امام ابن حجرؒ نے اس روایت کو 'حسن' کہا ہے۔(٢٦) حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی اس روایت سے حجت پکڑی ہے۔علامہ البانیؒ نے اس روایت کو

'ضعیف' کہا ہے(۲۷)۔

'سنن البیھقی' کی ایک روایت میں 'أَوَكُلَّ هٰذَا نُحَدِّثُكُمْ عَنْهُ؟' کے الفاظ بھی ہیں ۔بعض اصحاب کا خیال یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے ہر قول پر عمل ضروری ہے۔ان حضرات کا کہنا یہ ہے کہ قرآن میں اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا اور آپؐ کی اطاعت اُمت پر لازم ہے' لہٰذا جہاں بھی آپؐ کا کوئی قول آ جائے تو اس پر عمل کرنا لازم ہوگا' کیونکہ آپؐ کے اقوال آپؐ کی اطاعت میں داخل ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن میں اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا اور آپؐ کی اطاعت ہر اُمتی پر فرض ہے' لیکن کیا آپؐ کا ہر ہر قول اطاعت کی تعریف میں داخل ہے؟ اگر کوئی شخص ایسا سمجھتا ہے تو یہ موقف غلط ہے۔

اطاعتِ رسول ﷺ کا معنی و مفہوم اور شرعی حکم

اطاعت سے کیا مراد ہے؟ معروف لغوی ابن سیدہؒ نے اطاعت کی تعریف 'لَانَ وَانْقَادَ' سے کی ہے' یعنی نرم و لچکدار ہونا اور تابع بننا۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ مزاحمت (resistance) ترک کر کے کسی کی بات ماننا اور اس کا فرماں بردار ہونا اطاعت ہے۔حضرت عمر h نے جب اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمر i کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے انکار کر دیا۔اس پر حضرت عمر h رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے۔آپؐ نے حضرت عبداللہ بن عمر i کو بلوا کر کہا: أَطِعْ أَبَاكَ یعنی مزاحمت ترک کر کے اپنے اندر لچک پیدا کر اور اپنے باپ کی بات مان لے۔لہٰذا اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت سے مراد آپؐ کے مقابلے میں ہر قسم کی مزاحمت ترک کر کے آپؐ پر ایمان لانا اور آپؐ کی بات ماننا ہے۔

قرآن میں اطاعت کا لفظ کفار اور اہل ایمان دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے' لیکن دونوں کے لیے اس کے معنی میں باریک فرق ہے۔قرآن میں جب کفار' مشرکین' اہل کتاب اور منافقین سے رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو اس سے مراد رسولؐ کے بالمقابل مزاحمت ترک کر کے ان پر ایمان لانے میں ان کی بات ماننا ہے۔جیسا کہ حضرت نوح' حضرت صالح' حضرت ہود' حضرت لوط اور حضرت شعیب f نے اپنی اپنی قوم کو ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ﴾(الشُّعراء:۱۰۸' ۱۱۰' ۱۲۶' ۱۳۱' ۱۴۴' ۱۵۰' ۱۶۳' ۱۷۹) کا حکم جاری کیا۔ان آیات میں اطاعت سے مراد نبی پر ایمان لانے میں اس کی بات ماننا ہے' کیونکہ ایک شخص رسول کو رسول مانتا ہی نہ ہو تو اس سے اس چیز کا مطالبہ کرنا کہ وہ رسول کے احکامات پر عمل کرے' عبث ہے' اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کسی بھی رسول کی ایسی اطاعت کا منکر کافر ہے۔

سورۂ آل عمران کی آیت ﴿قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

الْکٰفِرِیْنَ﴾(آل عمران) میں اطاعت سے مراد رسول کے ایمان لانے کے مطالبے میں اس کی اطاعت ہے۔امام سیوطیؒ نے 'تفسیر جلالین' میں اس آیت کی تقدیر عبارت یوں بیان کی ہے: 'قُلْ(لھم) اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (فیما یأمرکم به من التوحید) فَاِنْ تَوَلَّوْا (أعرضوا عن الطاعة) فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ۔جمہور مفسرین امام ابن جریر طبری' امام رازی' امام قرطبی' امام بیضاوی' امام بغوی' امام ابن عطیہ' علامہ ابن جوزی' امام ابوحیان الاندلسی' علامہ آلوسی اور علامہ ابوبکر الجزائری n نے اپنی تفاسیر میں اس آیت کے شان نزول کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ آیت مبارکہ نجران کے عیسائی وفد کے بارے میں نازل ہوئی ہے جو کہ اللہ سے محبت کرنے کے دعوے دار تھے۔بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے یہ آیت مبارکہ ان یہود کے بارے میں نازل ہوئی جنھوں نے ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ﴾ کا دعویٰ کیا ہے۔﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ﴾ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ یہ عبداللہ بن ابی اور اس کے ان ساتھیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو صرف اللہ کی اطاعت کا دعویٰ کرتے تھے اور آپؐ کی اطاعت کے انکاری تھے۔

ہمارے خیال میں یہ تینوں ہی اس آیت کے شان نزول ہو سکتے ہیں اور اس کے مصداقات بنتے ہیں۔اگر اس آیت میں اہل کتاب سے خطاب مراد لیا جائے' جیسا کہ جمہور مفسرین کی رائے ہے' تو پھر 'فَاِنْ تَوَلَّوْا' سے مراد ان کا اللہ اور اس کے رسول کے مطالبۂ ایمان میں ان کی بات نہ ماننا ہے۔اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ایمان کے مطالبے میں ان کی بات سے اعراض کرے تو ایسا شخص بلاشبہ کافر ہے۔اسی طرح اگر کوئی شخص منافقین کی طرح صرف اللہ کی اطاعت کا قائل ہو اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت کا مطلقاً انکاری ہو اور آپ ﷺ کو مُطاع نہ سمجھتا ہو تو ایسا شخص بھی بلاشبہ دائرۂ اسلام سے خارج اور زندیق ہے۔لیکن کیا یہ آیت مبارکہ اس شخص کو بھی کافر قرار دیتی ہے جو کہ مؤمن صادق ہے اور آپؐ کی اطاعت کو بھی اللہ کی اطاعت کی طرح فرض سمجھتا ہے لیکن بعض جزوی مسائل میں آپؐ کی اطاعت سے انکاری ہے یا آپؐ کی اطاعت نہیں کرتا؟ اس مسئلے میں اہل سنت کے ہاں تفصیل ہے جس کو ہم جا بجا اس مضمون میں واضح کریں گے۔مفسرین نے اپنی تفاسیر میں واضح کیا ہے کہ 'فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ' میں اللہ کے رسول ﷺ کا نافرمان مؤمن صادق داخل نہیں ہے۔

ایک شخص اگر اللہ کی طرح اس کے رسول ﷺ کو بھی مُطاع مانتا ہے لیکن پھر بھی بعض ضروری معاملات میں آپؐ کی اطاعت نہیں کرتا تو ایسا شخص تمام اہل سنت کے نزدیک کافر نہیں ہے' ہاں گناہ گار اور فاسق ہوگا۔بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ فرماتے ہیں: میری فلاں بات پر عمل کرو' اگر عمل نہیں کرو گے تو کافر ہو جاؤ گے۔اب اگر کوئی شخص آپؐ کے اس حکم میں آپؐ کی اطاعت کا قائل تو ہو لیکن آپؐ کی اطاعت نہ کرے تو کیا یہ شخص کافر ہو گا؟ اس کو ایک سادہ سی مثال سے سمجھیں کہ اللہ کے

رسول ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ کُفَّارًا یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ)) (۲۸)

''میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگ جاؤ''۔

اس حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں کے جو گروہ میری وفات کے بعد آپس میں قتال کریں گے تو وہ کافر ہو جائیں گے۔ اسی طرح 'مَنْ حَلَفَ بِغَیْرِ اللّٰہِ فَقَدْ کَفَرَ' اور 'بَیْنَ الْمُسْلِمِ وَبَیْنَ الْکُفْرِ تَرْکُ الصَّلَاۃِ' اور 'إِذَا قَالَ الرَّجُلُ لِاَخِیْہِ یَا کَافِرُ فَقَدْ بَاءَ بِھَا أَحَدُھُمَا' اور 'سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُہٗ کُفْرٌ' وغیرہ کی طرح کی بہت سی ایسی احادیث مبارکہ موجود ہیں جن میں آپ ؐ نے اپنے کسی حکم کی خلاف ورزی کو کفر قرار دیا ہے۔ تو کیا ان احکامات میں آپ ؐ کی نافرمانی کرنے والا شخص کافر ہے؟ اہل سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس طرح کا شخص ایسا کافر نہیں ہے کہ وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے اور دائمی جہنمی ہو۔ اہل سنت کا ایک گروہ اس کو 'کُفْرٌ دُوْنَ کُفْرٍ'' قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ایسے شخص کا کفر 'عملی کفر' ہے۔ ائمہ ثلاثہ یعنی امام مالکؒ امام شافعیؒ امام احمدؒ اور محدثین کا قول یہی ہے۔ جبکہ اہل سنت کا دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ 'کفر مجازی' ہے' یعنی حقیقی نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور بعض فقہاء کا یہی قول ہے۔ لہٰذا ایسے شخص کو عملی کافر کہیں یا مجازی کافر' بہر حال اس بات پر جمیع اہل سنت کا اتفاق ہے کہ ایسا شخص 'کافر حقیقی' نہیں ہے کہ جس سے وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو یا آخرت میں دائمی جہنم کا مستحق ہو۔ (۲۹)

اس کے برعکس خوارج اور معتزلہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ان احادیث کی وجہ سے گناہ کبیرہ کا مرتکب دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ خوارج اس کو کافر بھی قرار دیتے ہیں جبکہ معتزلہ کافر نہیں کہتے' لیکن یہ دونوں گروہ اس بات پر متفق ہیں کہ وہ دائمی جہنمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوارج نے صحابہ کرامؓ پر کفر کے فتوے لگائے اور حضرت علیؓ و معاویہؓ جیسے جلیل القدر صحابہؓ کے خون کو مباح قرار دیا۔ اگر خوارج اور معتزلہ کا نظریہ مان لیا جائے پھر تو معاذ اللہ! جنگ جمل اور جنگ صفین میں شامل تمام صحابہؓ کافر ہو گئے تھے؟ کیونکہ انہوں نے ((لَا تَرْجِعُوْا بَعْدِیْ کُفَّارًا یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ)) میں اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت نہ کی تھی۔

اب اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اگر بعض مفسرین مثلاً ابن کثیرؒ وغیرہ نے 'فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ' سے مراد مسلمانوں کا ایک گروہ لیا ہے تو اس سے ان کی مراد یہ نہیں ہے کہ مسلمان آپ ؐ کی جزوی عدم اطاعت سے حقیقی کافر ہو جاتے ہیں' بلکہ ان کی مراد یہاں پر 'کفر دون کفر' اور عملی کفر ہے۔ امام ابن کثیرؒ کے شاگرد ابن ابی العز الحنفیؒ نے 'شرح عقیدہ طحاویہ' میں 'لَا نُکَفِّرُ اَحَدًا بِذَنْبٍ' کے تحت اس موضوع پر کافی مفصل بحث کی ہے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ 'کفر دون کفر' کی اصطلاح مابعد کے زمانوں کی نہیں ہے' بلکہ اسے سب سے پہلے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے استعمال کیا تھا۔

اوپر ہم اس مسئلے کو زیر بحث لائے ہیں کہ ایک شخص اللہ کے رسول ﷺ کے ایک حکم کو لازمی حکم مانتا ہے، لیکن آپ ﷺ کی اس حکم میں اطاعت نہیں کرتا تو اس کا کیا حکم ہے؟ صحیح روایات اور ائمہ اہل سنت کی رائے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ایسا شخص عدم اطاعت کے باوجود کافر نہیں ہے۔ اور اگر آپؐ نے اس مسئلے میں اپنی عدم اطاعت کو کفر قرار دیا ہے تو پھر بھی وہ شخص حقیقی کافر نہ ہوگا بلکہ مجازی یا عملی کافر ہوگا، جیسا کہ صحابہؓ بعض ایسے احکامات میں عدم اطاعت کے مرتکب ہوئے ہیں جن کے ارتکاب کو آپؐ نے کفر قرار دیا تھا۔ اب دوسرے مسئلے کی طرف آتے ہیں کہ کوئی مسلمان اللہ کے رسول ﷺ کے کسی لازمی حکم کا انکار کر دے تو اس کا کیا حکم ہے۔ اب اس انکار کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ آپؐ کے اس لازمی حکم کو منسوخ سمجھتا ہو یا اس کی کوئی ایسی تأویل کرتا ہو کہ وہ لازمی حکم اس کے نزدیک لازمی نہ رہے، مستحب یا مباح کے دائرے میں چلا جائے۔ یا وہ آپؐ کے اس حکم کو بعض حالات یا اسباب کے ساتھ خاص قرار دیتا ہو یا کوئی بھی وجہ نہ ہو اور وہ اس کا انکار کر دے وغیرہ۔ اگر کوئی شخص کسی سنت کو منسوخ سمجھے یا اس کی تأویل کرے یا اس کو بعض حالات و اسباب سے خاص قرار دے، تو ایسی صورت میں اس سنت کا منکر اہل سنت کے نزدیک بالاتفاق کافر نہ ہوگا۔ اس باب میں ہم یہاں پر صرف ایک اصولی بات کا ذکر کر دیتے ہیں کہ اہل سنت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص آپؐ کی کسی ایسی لازمی سنت کا انکار کر دے جو کہ خبر واحد سے ثابت ہو تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

حال ہی میں ایک نیا فلسفہ یہ بھی متعارف ہوا ہے کہ کسی فرض کی ادائیگی کا جو طریقہ ہمیں بذریعہ سنت ملتا ہے، فرض کی ادائیگی میں اس طریقے کی پیروی اُمت مسلمہ کے لیے لازم ہے۔ اور اگر کوئی شخص اس طریقے سے کسی فرض کو ادا نہیں کرتا جس طرح سے سنت میں اس کی ادائیگی کا طریقہ ملتا ہے تو ایسے شخص کا نہ تو وہ فرض ادا ہوگا اور نہ ہی وہ اُخروی نجات حاصل کر سکے گا، کیونکہ فرض کی ادائیگی کا جو طریقہ سنت سے ملتا ہے وہ اطاعت ہے اور آپؐ کی عدم اطاعت کو فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ، میں کفر قرار دیا گیا ہے۔ اس نظریہ کے حامل حضرات اس کے لیے ایک مثال بیان کرتے ہیں کہ نماز فرض ہے اور اس کی ادائیگی کا طریقہ سنت سے ملتا ہے، لہٰذا اگر کوئی سنت کے مطابق یہ فرض ادا نہیں کرتا تو اس کی نماز قبول نہیں ہے اور نہ ہی اس کی نجات ہوگی۔ اسی طرح اقامت دین کی جدوجہد فرض ہے۔ اس کی ادائیگی کا طریقہ سنت سے ملتا ہے، اور جو کوئی (مِن وعَن) اس منہج کے مطابق اقامتِ دین کی جدوجہد کا فریضہ سرانجام نہیں دے رہا جیسے کہ نبی اکرم ﷺ کی سیرت سے ملتا ہے، تو ایسے شخص کا یہ فریضہ ادا نہ ہوگا اور نہ ہی اُخروی نجات ہوگی (مثلاً جماعت اسلامی، تبلیغی جماعت، حزب التحریر، علمائے دیوبند، جماعت اہل حدیث، جہادی تحریکیں وغیرہ)۔ کیونکہ ان حضرات کے نزدیک یہ تمام گروہ یا تو اقامت دین کا فرض ادا ہی نہیں کر رہے یا اگر ادا کر رہے ہیں تو سیرت کے طریقے کے مطابق ادا نہیں کر رہے۔

اس نقطۂ نظر کے حاملین کو ہمارا جواب یہ ہے کہ جہاں تک نماز کا تعلق ہے تو نماز کو جس طرح فرض قرار دیا گیا ہے اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے ((صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ)) کے ذریعے اس کا سنت کے مطابق پڑھنا بھی فرض قرار دیا ہے۔ اسی طرح کا معاملہ حج کا بھی ہے کہ آپؐ نے حج کی فرضیت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ اس کو اس طریقے کے مطابق ادا کرنا بھی لازم قرار دیا ہے جس طریقے پر آپؐ نے اسے ادا کیا ہے۔ مثلاً آپؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: ((خُذُوْا عَنِّیْ مَنَاسِکَکُمْ))، یعنی مجھ سے حج کے مناسک سیکھ لو۔ لیکن بہت سے فرائض ایسے ہیں جن کی ادائیگی کو تو لازم قرار دیا گیا ہے لیکن ان کو اس طریقے پر ادا کرنا جیسے کہ آپؐ نے ادا کیا ہے، شریعت اسلامیہ میں لازم نہیں کیا گیا ہے۔ مثلاً مسلمانوں پر فرمانِ الٰہی ﴿کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ﴾ کے ذریعے قصاص کو لازم کیا گیا۔ آپؐ کے زمانے میں قصاصاً قتل کرنے کے لیے تلوار سے گردن اڑائی جاتی تھی۔ اب اس کی جگہ پھانسی کے طریقے نے لے لی ہے۔ اب کون سا عالم دین ایسا ہے جو یہ فتویٰ جاری کرے گا کہ بذریعہ پھانسی قصاص لینے سے قصاص کا فریضہ ادا نہیں ہوتا اور اگر کوئی اسلامی ریاست قصاص کے حکم کی ادائیگی کے لیے پھانسی کا طریقہ اختیار کرتی ہے تو اس کی اُخروی نجات ممکن نہیں ہے؟ حق بات یہ ہے کہ جس فرض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اس کے طریقے کو بھی لازم قرار دیا گیا ہو اُس فرض کو اس طریقے کے مطابق ادا کرنا لازم ہے، لیکن جن فرائض میں صرف فرض کی ادائیگی پر زور دیا گیا ہے، کوئی طریقہ لازم نہیں کیا گیا ان فرائض کی ادائیگی کے لیے سیرت النبیؐ سے رہنمائی لیتے ہوئے کوئی بھی ایسا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے جس سے اس فرض کی ادائیگی بہتر طریقے سے ہو سکے، بشرطیکہ وہ طریقہ کسی شرعی نص کے خلاف نہ ہو۔ مثلاً اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے ظلم کے خاتمے اور عدل کے قیام کے لیے قتال کو اُمت مسلمہ پر فرض قرار دیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے زمانے کے حالات وواقعات اور اسباب ووسائل کو مدنظر رکھتے ہوئے اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے کبھی صلح کی اور کبھی جنگ، آپؐ نے تلواروں سے جنگ لڑی اور گھوڑوں، اونٹوں وغیرہ پر سفر کیا، اپنے دفاع کے لیے کبھی خندق کھودی تو کبھی آگے بڑھ کر اقدام کیا، آپؐ نے ہجرت بھی کی اور اللہ کے دشمنوں کو قتل بھی کیا اور معاف بھی کیا۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم نے بھی کسی مسلمان معاشرے مثلاً پاکستان میں ظلم کے خاتمے، اللہ کے دین کی سربلندی اور نظامِ عدل کے قیام کے لیے بعینہٖ اسی منہج کو اختیار کرنا ہے جس کو اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے دَور میں اختیار کیا تھا تو گویا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ ہمیں لازماً ہجرت بھی کرنی ہوگی ☆ اور پاکستانی افواج سے قتال بھی، غزوۂ بدر کی طرح حکومت کے سرکاری خزانوں کو لوٹنے کے لیے اقدام بھی

☆ مثلاً پاکستان سے افغانستان کی طرف، بلکہ انڈیا شاید اس ہجرت کے لیے زیادہ مناسب ہو، کیونکہ وہاں مسلمانوں کی تعداد افغانستان کی نسبت زیادہ ہے اور آپ ﷺ نے ہجرت اس علاقے کی طرف کی تھی جہاں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔

کرنا ہوگا اور غزوۂ اُحد کی طرح پاکستانی افواج سے لڑائی بھی، ہمیں اپنے دفاع کے لیے خندق بھی کھودنی ہوگی اور صلح حدیبیہ کی طرح اللہ کے دشمنوں یعنی حکومت پاکستان سے صلح بھی کرنی ہوگی۔ غزوۂ خیبر کی طرح اسرائیل پر بھی حملہ کرنا ہوگا اور فتح مکہ کی طرح دس ہزار کا لشکر لے کر حکومت پاکستان پر چڑھائی بھی۔ یہ وہ نتائج ہیں جو اس طرزِ فکر سے لازماً برآمد ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس قول کے قائلین ان نتائج کو بقائمی ہوش وحواس قبول نہیں کریں گے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کی سیرت بحیثیت مجموعی ہمارے لیے ایک نمونہ ہے۔ یعنی ہم سیرت نبوی ﷺ کی جزئیات اور تفصیلات سے قطع نظر اس سے من جملہ رہنمائی لے سکتے ہیں، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾(الاحزاب:۲۱)

''تمہارے لیے اللہ کے رسول (ﷺ کی زندگی) میں بہترین اسوہ ہے''۔

اس آیت کے معنی ومفہوم پر ہم آگے چل کر تفصیلی بحث کریں گے۔ لہٰذا اقامت دین کے فرض کی ادائیگی کے لیے سیرت نبوی ﷺ سے ایک مجموعی رہنمائی لیتے ہوئے عصر حاضر میں کوئی منہج اختیار کرنا تو درست بھی ہوگا اور مطلوب بھی، لیکن اقامت دین کے فرض کی ادائیگی کے لیے سیرت کو بالتفصیل یا جزئی طور پر حجت قرار دینا سوائے غلو فی الدین اور شرعی نصوص کی خلاف ورزی کے اور کچھ نہیں ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی سینکڑوں روایات ایسی ہیں جن میں آپؐ نے مسلمانوں سے قتال کو حرام قرار دیا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ پاکستانی افواج کافر ہیں لہٰذا ان سے قتال جائز ہے تو اب دو صورتیں ہیں۔ یا تو یہ فتویٰ لگانے والا مجتہد اور فقیہہ ہے یا پھر عامی ہے۔ پہلی صورت میں فتویٰ لگانے والا فتویٰ دینے کی صلاحیت رکھتا ہے لہٰذا یا تو مجتہد مخطی ہوگا یا مصیب، جبکہ دوسری صورت میں فتویٰ دینے کی اہلیت اور صلاحیت نہیں ہے لہٰذا لازماً مخطی ہی ہوگا۔ جیسا کہ آپؐ کا ارشاد ہے:

((مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ))(۳۰)

''جس نے قرآن کی تفسیر میں اپنی رائے سے کوئی بات کہی، پس اگر وہ صحیح بھی ہو پھر بھی وہ خطا کار ہے''۔

امام ابن حجرؒ نے اس روایت کو حسن کہا ہے۔(۳۱) امام ابن الصلاح نے اس کو 'دون الحسن' کہا ہے۔(۳۲) علامہ احمد شاکر نے اس کو 'صحیح' کہا ہے۔(۳۳) علامہ البانیؒ نے اس کو 'ضعیف' کہا ہے۔(۳۴)

شارحینِ حدیث نے وضاحت کی ہے کہ اس روایت سے مراد وہ افراد ہیں جو کہ قرآن کی تفسیر کی اہلیت نہیں رکھتے اور پھر بھی اس کی تفسیر کرتے ہیں۔ تو گویا یہ حضرات قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ضروری علومِ اسلامیہ سے ناواقف ہو اور وہ قرآنی آیات کی تطبیق اسلامی معاشروں پر شروع کر دے اور مسلمانوں کے سوادِ اعظم کو کافر، مشرک اور منافق بنا دے تو ایسا شخص بھی اس حدیث کا

مصداق ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس فعل کی اس قدر مذمت کی ہے کہ اگر اس کی رائے درست بھی ہو جائے تو پھر بھی وہ خطا کار ہے' یعنی آپ ؐ نے ایسے تمام مختصر راستے (short cuts) بند کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ علوم اسلامیہ کو سیکھے بغیر قرآن کی تفسیر وتعبیر کی طرف لے جانے والے ہوں۔

پس عامی اگر افواج پاکستان پر کفر کا فتویٰ لگائے تو وہ درحقیقت اپنے اوپر کفر کا فتویٰ لگا رہا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

((إِذَا قَالَ الرَّجُلُ لِأَخِيْهِ يَا كَافِرُ فَقَدْ بَاءَ بِهِ أَحَدُهُمَا))(۳۵)

''جب کوئی آدمی اپنے کسی مسلمان بھائی کو کہے: اے کافر! تو ان دونوں میں سے ایک کافر ہو جاتا ہے''۔

اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان سے مقصود یہ ہے اگر تو جس کو اس نے کافر کہا وہ واقعتاً کافر ہوا تو یہ کہنے والا سچا ہے' اور اگر جس کو اس نے کافر کہا ہے وہ اللہ کے نزدیک کافر نہیں ہے تو کہنے والا شخص خود کافر بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علماء کفر کا فتویٰ لگانے میں بہت محتاط ہیں۔

جہاں تک اُخروی نجات کا معاملہ ہے تو اس کے بارے میں اہل سنت کا متفق علیہ عقیدہ یہی ہے کہ ہم کسی بھی مسلمان پر کسی فرض کی ادائیگی کے ترک یا حرام کے ارتکاب کی وجہ سے یہ فتویٰ نہیں جاری کریں گے کہ اس کی نجات نہیں ہوگی۔ اہل سنت کے نزدیک ایسا فتویٰ جاری کرنا شرک ہے۔ مثلاً ایک صحیح روایت میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ بنی اسرائیل میں دو دوست تھے۔ ان میں ایک بڑا متقی اور پرہیز گار تھا جبکہ دوسرا عرصۂ دراز سے کسی گناہ کبیرہ میں مبتلا تھا۔ اس متقی کا جب بھی اپنے گناہ گار بھائی کے پاس سے گزر ہوتا تو وہ اس کو اس گناہ سے منع کرتا تھا۔ اسی طرح سالہا سال گزر گئے۔ ایک دن وہ گناہ گار آدمی اپنے متقی بھائی کی تبلیغ کے جواب میں کہنے لگا:

((..... خَلِّنِيْ وَرَبِّيْ أَبُعِثْتَ عَلَيَّ رَقِيْبًا؟ قَالَ وَاللّٰهِ لَا يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكَ [أَوْ لَا يُدْخِلُكَ اللّٰهُ الْجَنَّةَ] فَقَبَضَ أَرْوَاحَهُمَا فَاجْتَمَعَا عِنْدَ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ' فَقَالَ لِهٰذَا الْمُجْتَهِدِ أَكُنْتَ بِيْ عَالِمًا أَوْ كُنْتَ عَلٰى مَا فِيْ يَدِيْ قَادِرًا؟ وَقَالَ لِلْمُذْنِبِ اذْهَبَ فَادْخُلِ الْجَنَّةَ بِرَحْمَتِيْ وَقَالَ لِلْآخَرِ اذْهَبُوْا بِهِ إِلَى النَّارِ))(۳۶)

''میرا معاملہ میرے ربّ پر چھوڑ دے۔ کیا تجھے میرے اوپر نگران بنایا گیا ہے؟ تو متقی آدمی نے کہا: اللہ کی قسم! اللہ تجھے معاف نہیں کرے گا [یا یوں کہا کہ تجھے جنت میں داخل نہیں کرے گا]۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی ارواح قبض کیں اور وہ دونوں اپنے ربّ کے دربار میں جمع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے متقی آدمی سے کہا: کیا تو میرے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتا ہے یا جو میرے ہاتھ میں ہے (یعنی مغفرت اور جنت میں داخل کرنا) کیا تو اس پر قادر ہے؟ اللہ تعالیٰ نے گناہ گار سے کہا: تو

جنت میں داخل ہو جا اور متقی کے بارے میں فرشتوں کو حکم دیا: اس کو آگ کی طرف لے جاؤ''۔
علامہ البانیؒ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے(۳۷)۔ شیخ احمد شاکر نے بھی اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔(۳۸)

اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال کی درجہ بندی

رسول اللہ ﷺ کا ہر قول ہمارے لیے شریعت ہے یا نہیں' اور اگر ہے تو اس میں کوئی درجہ بندی بھی ہے یا نہیں؟ اس بات کی وضاحت اس لیے از حد ضروری ہے کہ ناواقفیت کی بنا پر سنت رسول ﷺ کے معاملے میں دو ایسی انتہائیں وجود میں آجاتی ہیں جو سنت کی حیثیت کو افراط و تفریط کا شکار کر کے اہل سنت کے منہج سے دور لے جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک انتہا وہ ہے جسے منکرین سنت نے اختیار کیا کہ سنت کی آئینی حیثیت کا انکار کر دیا جائے یا اسے چند مَن چاہی سنتوں تک محدود کر دیا جائے' اور دوسری انتہا یہ نظریہ ہے کہ اقوالِ رسول ﷺ میں پائی جانے والی تعلیمات میں تکلیفِ شرعی کے اعتبار سے درجہ بندی کو یہ کہہ کر ردّ کر دیا جائے کہ یہ تو فقہاء کی پیدا کردہ تقسیم ہے جس سے سنت کا استخفاف ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم اس بحث کو سمجھنے کے لیے حدیث کی کتب سے چند اصول پیش کر رہے ہیں۔ ہماری کوشش ہوگی کہ وضاحت کے لیے براہِ راست رسول اللہ ﷺ کی سنت و سیرت کے حوالے پیش کیے جائیں تاکہ کسی کو یہ اعتراض نہ ہو کہ فقہ تو بہت بعد کی پیداوار ہے جس میں (معاذ اللہ) سنت کی درجہ بندی کر کے استخفافِ سنت جیسے فتنوں کا راستہ پیدا کر دیا گیا ہے۔

(۱) اللہ کے نبی ﷺ کے اقوال سے بعض اوقات کسی فعل کا وجوب ثابت ہوتا ہے۔ حضرت جریر بن عبداللہ h فرماتے ہیں:

سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَنْ نَظْرَةِ الْفَجْأَةِ فَقَالَ : ((اِصْرِفْ بَصَرَكَ))(۳۹)

''میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے اچانک (کسی اجنبی عورت پر) نظر پڑ جانے کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے جواب دیا: ''اپنی نظر پھیر لو''۔

امام ابن تیمیہؒ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔(۴۰) علامہ البانیؒ نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔(۴۱)

اس حدیث میں آپ ﷺ نے کسی اجنبی عورت پر اچانک نظر پڑ جانے کی صورت میں اس سے اپنی نظریں پھیرنے کا جو حکم دیا ہے یہ حکم فقہاء کے نزدیک وجوب کا فائدہ دے رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آپ ﷺ کے اس حکم کا انکار کر دے تو اس شخص کا کسی اسلامی معاشرے میں حکم (status) کیا ہے؟ کیا ایسا شخص کافر ہے؟

جمہور علماءِ مالکیہ' شوافع' حنابلہ' اہل الظاہر اور اہل الحدیث کے نزدیک اگر اللہ کے رسول ﷺ کی سنت سے کوئی ایسا حکم ثابت ہو جس کے کرنے کو لازم ٹھہرایا گیا ہو تو اسے فرض یا واجب کہتے ہیں۔ لہٰذا فرض یا واجب وہ ہے جس کے کرنے کو شارع نے مکلّف پر لازم ٹھہرایا ہو اور اس کو نہ کرنا باعث ملامت

بھی ہو اور اس کا تارک آخرت میں سزا کا بھی مستحق ہو۔ جمہور علماء کے نزدیک فرض اور واجب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں ایک ہی شے ہیں۔ چاہے کسی حکم کا لزوم قرآن سے ثابت ہو یا سنت سے' دونوں ہی فرض ہیں' جبکہ احناف کے نزدیک فرض وہ ہے جو کہ قطعی ذریعہ مثلاً قرآن' متواتر حدیث یا اجماعِ اُمت سے ثابت ہو اور اس کے کرنے کو شارع d نے لازم ٹھہرایا ہو' جبکہ واجب وہ ہے جو کہ ظنی ذریعہ یعنی خبر واحد سے ثابت ہو اور اس کے کرنے کو شارعؐ نے لازم ٹھہرایا ہو۔ لیکن تمام ائمہ اہل سنت مالکیہ' احناف' شوافع' حنابلہ اور اہل الحدیث کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کسی فعل کی فرضیت یا وجوبیت اللہ کے رسول ﷺ کی سنت (یعنی خبر واحد) سے ثابت ہو رہی ہو اور کوئی شخص اس فرض یا واجب کو ماننے سے انکار کر دے تو اس کے منکر کو دنیا میں ملامت کی جائے گی اور وہ آخرت میں سزا کا بھی مستحق ہوگا' لیکن اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ الشیخ عاصم الحدادؒ لکھتے ہیں:

> ''اعتقادی مسائل میں دوسرے تمام ائمہ حنفیہ متفق ہیں کہ فرض یا واجب کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جس کے منکر کی تکفیر کی جاتی ہے اور اس سے مراد وہ فرض یا واجب ہے جس کا علم قرآن یا تواتر کے ذریعے ہوا ہو اور دوسرا وہ جس کے منکر کی تکفیر نہیں کی جاتی اور اس سے مراد وہ فرض یا واجب ہے جس کا علم اخبار آحاد کے ذریعہ ہوا ہو''۔ (۴۲)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ایسی سنت کے منکر پر دنیا میں کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جائے گا لیکن اس کو سخت ملامت کی جائے گی اور آخرت میں بھی سزا کا مستحق ہوگا۔ اسی طرح ایسی سنت کے تارک کو بھی دنیا میں ملامت اور آخرت میں سزا ہوگی۔ یہ بات ذہن میں رہے کہ خبر واحد سے ثابت ہونے والے کسی حکم کی فرضیت یا وجوبیت پر اگر علمائے اُمت کا اجماع ہو تو پھر اس سنت کے منکر کی اجماع کی خلاف ورزی کی وجہ سے تکفیر کی جائے گی۔

(۲) بعض اوقات اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال سے استحباب ثابت ہوتا ہے۔ مستحب سے مراد یہ ہے کہ شارعؑ نے کسی کام کے کرنے کا مطالبہ کیا ہو لیکن اس کو مکلّف پر لازم قرار نہ دیا ہو۔ بعض اوقات مستحب میں تاکید زیادہ ہوتی ہے اور بعض اوقات کم۔ اسی لیے فقہاء نے اس کی دو قسمیں کی ہیں' یعنی مؤکدہ اور غیر مؤکدہ۔ آپ ﷺ کے اقوال سے بعض اوقات سنت مؤکدہ ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً آپؐ کا ارشاد ہے:

((اِذَا دَخَلَ اَحَدُکُمُ الْمَسْجِدَ فَلْیَرْکَعْ رَکْعَتَیْنِ قَبْلَ اَنْ یَجْلِسَ)) (۴۳)

''جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو وہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھ لے''۔

یہ ذہن میں رہے کہ جمہور فقہاء اور محققین اصولیین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن و سنت میں جہاں بھی امر کا صیغہ آئے گا اس سے مراد فرضیت یا وجوب ہوگا' لیکن اگر کچھ منصوص یا غیر منصوص قرائن ایسے ہوں جن سے معلوم ہو کہ یہ حکم یہاں لزوم کے لیے نہیں ہے تو پھر اس سے مراد استحباب لیا جائے گا۔ بعض دوسری صحیح روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم یہاں وجوب کے لیے نہیں ہے۔ ان روایات کو امام عبدالرحمٰن

مبارکپوریؒ نے سنن الترمذی کی شرح 'تحفۃ الاحوذی' میں بیان کیا ہے۔امام ابن حجرؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

واتفق أئمة الفتوى أن الأمر فی ذلک للندب(۴۴)

''اہل فتویٰ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس حدیث میں امر کا صیغہ استحباب کے لیے ہے''۔

لہٰذا تحیۃ المسجد کی دو رکعات سنت مؤکدہ ہے۔ جہاں تک اس بات کا معاملہ ہے کہ یہ کیسے معلوم ہوگا کہ اگر آپ ﷺ کا قول وجوب کے لیے نہیں ہے تو پھر سنت مؤکدہ ہے یا غیر مؤکدہ؟ اس کا تعین بھی قرائن سے ہوگا اور یہ قرائن منصوص بھی ہو سکتے ہیں' مثلاً دوسری احادیث مبارکہ' اور غیر منصوص بھی' مثلاً صحابہؓ کا عمل وغیرہ۔ امام عبدالرحمٰن مبارکپوری نے 'تحفۃ الاحوذی' میں اس موضوع سے متعلق کافی روایات کو اکٹھا کیا ہے جن کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تحیۃ المسجد کی دو رکعات سنت مؤکدہ ہیں نہ کہ غیر مؤکدہ۔طوالت کے خوف سے ہم ان روایات کو یہاں بیان نہیں کر رہے۔

جہاں تک سنت مؤکدہ کے حکم کا تعلق ہے تو ہم پہلے بھی اسے بیان کر چکے ہیں کہ سنت مؤکدہ کے منکر کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔اس پر عمل کرنے والے کو ثواب ہوگا اور اس کے تارک کو دنیا میں ملامت کی جائے گی' لیکن آخرت میں عذاب نہیں ہوگا۔سنن مؤکدہ کے حکم کے بارے میں دو ابحاث بڑی اہم ہیں:

ا: اگر کوئی شخص کسی سنت مؤکدہ کو مستقل طور پر ترک کر دے تو یہ جائز نہیں ہے۔مثلاً کوئی ساری زندگی صرف فرض نماز پڑھتا رہے اور سنن مؤکدہ ادا نہ کرے تو شرعاً گناہ گار ہوگا۔

ب: اگر کوئی معاشرہ' جماعت یا گروہ کسی سنت مؤکدہ کو کلی طور پر ترک کر دے تو یہ جائز نہیں ہے۔امام شاطبیؒ نے اس بارے میں 'الموافقات' میں بڑی عمدہ بحث کی ہے کہ ایک سنت مؤکدہ فرد کے اعتبار سے تو سنت ہوتی ہے لیکن اجتماع یا معاشرے کے اعتبار سے فرض کفایہ ہوتی ہے۔مثلاً نکاح کرنا جمہور علماء کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے۔اگر کوئی شخص ذاتی طور پر نکاح کی ضرورت محسوس نہ کرے یا کسی اور وجہ سے نکاح نہ کرے تو دنیا میں تو اسے بغیر کسی شرعی عذر کے نکاح نہ کرنے پر ملامت کی جائے گی لیکن آخرت میں وہ عذاب کا مستحق نہ ہوگا' لیکن کسی مسلمان معاشرے کے لیے یہ بالکل بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اجتماعی طور پر نکاح کی سنت کو ترک کر دے۔ایسی صورت میں سارا معاشرہ گناہ گار ہوگا اور آخرت میں عذابِ الٰہی کا مستحق ہوگا۔

بعض اوقات رسول اللہ ﷺ کے قول سے کسی فعل کے مستحب ہونے کا علم ہوتا ہے اور یہ فعل سنتِ غیر مؤکدہ ہوتا ہے نہ کہ سنت مؤکدہ۔مثلاً آپ ﷺ کے ایک فرمان کے الفاظ ہیں:

((اِنَّ الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی لَا یَصْبُغُوْنَ فَخَالِفُوْھُمْ)) (۴۵)

''یہود اور عیسائی خضاب نہیں کرتے۔پس تم ان کی مخالفت کرو (یعنی خضاب کرو)''۔

یہود و نصاریٰ کی مخالفت کے قرینے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس حدیث میں یہ حکم وجوب کے لیے ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ حکم استحباب کے لیے ہے' جیسا کہ صحابہؓ کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے' کیونکہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر i وغیرہ خضاب کرتے تھے جبکہ حضرت علیؓ' حضرت انسؓ' حضرت اُبی بن کعب اور حضرت سلمہ بن اکوع j وغیرہ خضاب نہیں کرتے تھے۔(٤٦) وہ روایات جن میں اللہ کے رسول ﷺ نے داڑھی رکھنے کا حکم دیا ہے ان کا اسلوبِ بیان بھی ایسا ہی ہے کہ یہود و نصاریٰ کی مخالفت کرو یا مشرکین کی مخالفت کرو اور داڑھی بڑھاؤ۔ ان راویات میں داڑھی رکھنے کا حکم وجوب کے لیے ہے کیونکہ تمام صحابہ j کا عمل اس بات پر قرینہ ہے کہ یہ امر وجوب کے لیے ہے۔

ایک اور روایت میں حضرت عبداللہ المزنی h فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((صَلُّوْا قَبْلَ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ)) قَالَ فِي الثَّالِثَةِ : ((لِمَنْ شَاءَ)) كَرَاهِيَةَ أَنْ يَتَّخِذَهَا النَّاسُ سُنَّةً (٤٧)

''مغرب کی فرض نماز سے پہلے نماز (دو رکعت نفل) پڑھو''۔ آپؐ نے یہ بات تین مرتبہ کہی اور تیسری مرتبہ یہ اضافہ کیا کہ ''جو چاہے پڑھ لے''۔ اور آپؐ نے تیسری مرتبہ 'جو چاہے' کے الفاظ اس لیے کہے کہ لوگ اس کو سنت (مؤکدہ) نہ سمجھ لیں''۔

اس حدیث میں 'لِمَنْ شَاءَ' کے الفاظ سے واضح ہو گیا کہ آپؐ کا حکم استحباب کے معنی میں ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ صحابہؓ سنت کا لفظ سنت مؤکدہ (یعنی ایسی سنت جس کا چھوڑنا باعث ملامت ہو) کے لیے بھی استعمال کرتے تھے' اسی لیے صحابیؓ نے یہ وضاحت کی کہ آپؐ نے 'لِمَنْ شَاءَ' کے ذریعے واضح کیا کہ لوگ اس عمل کو سنت (مؤکدہ) نہ بنالیں۔ امام ابن حجرؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

(أَنْ يَتَّخِذَهَا النَّاسُ سُنَّةً) أي طريقة لازمة لا يجوز تركها أو سنة راتبة يكره تركها وليس المراد ما يقابل الوجوب(٤٨)

''اس جملے سے مراد یہ ہے کہ لوگ اس کو کوئی ایسا لازمی طریقہ نہ سمجھ لیں کہ جس کا ترک کرنا جائز نہیں ہوتا یا اس کو سنت مؤکدہ نہ بنالیں کہ جس کو چھوڑنا مکروہ ہے۔ یہاں اس حدیث میں سنت سے مراد وہ نہیں ہے جو واجب کے بالمقابل ہو''۔

(٣) بعض اوقات رسول اللہ ﷺ کا قول مبارک کسی فعل کی اباحت بیان کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً:

((حَدِّثُوْا عَنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ وَلَا حَرَجَ)) (٤٩)

''بنی اسرائیل سے بیان کرو (یعنی اسرائیلی روایات) اور اس میں کوئی گناہ نہیں ہے''۔

اس حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ نے قرآن مجید میں بنی اسرائیل سے متعلقہ مجمل واقعات کی تفصیل کے لیے بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس حدیث میں 'حَدِّثُوْا' امر کا صیغہ نہی وجوب

کے لیے ہے اور نہ ہی استحباب کے لیے، بلکہ یہ اباحت کے لیے ہے، یعنی بنی اسرائیل سے روایت کرنا جائز ہے بشرطیکہ وہ روایت احکامِ شرعیہ سے متعلق نہ ہو اور دوسرے یہ کہ وہ شریعتِ اسلامیہ کے بنیادی عقائد یا تعلیمات کے خلاف نہ ہو۔ امام ابن حجرؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

حدثوا صيغة أمر تقتضى الوجوب فأشار إلى عدم الوجوب و أن الأمر فيه للإباحة بقوله و لا حرج(۵۰)

''حَدِّثُوْا صیغہ امر ہے جو وجوب کا متقاضی ہے، لیکن آپؐ نے اس فعل کے عدم وجوب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لہٰذا یہاں امر اباحت کے معنی میں ہے، جیسا کہ 'وَلَا حَرَجَ' کے الفاظ اس کی اباحت کی دلیل ہیں''۔

مباح کی تعریف اور حکم کے بارے میں الدکتور عبدالکریم زیدان لکھتے ہیں:

المباح: هو ما خير الشارع المكلف بين فعله و تركه، و لا مدح و لا ذم على الفعل و الترک..... وان حكم المباح أنه لا ثواب فيه و لا عقاب، و لكن قد يثاب عليه بالنية والقصد كمن يمارس أنواع الرياضية البدنية بنية تقوية جسمه، ليقوى على محاربة الأعداء(۵۱)

''مباح سے مراد یہ ہے کہ شارع نے مکلّف کو کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں اختیار دیا ہو..... مباح کا حکم یہ ہے کہ اس میں نہ ثواب ہے اور نہ گناہ، لیکن اگر اچھی نیت اور ارادے سے کوئی مباح کام کرے گا تو اس کا ثواب ہوگا۔ مثلاً کوئی شخص اس لیے ورزش کرتا ہے تاکہ اس کا جسم مضبوط ہو اور وہ دینِ اسلام کے دشمنوں سے جہاد کرے تو اس ورزش کا بھی ثواب ہوگا''۔

فرض، واجب اور مستحب کی طرح مباح کے قواعد وضوابط کے بارے میں بھی اصولیین نے اصول کی کتابوں میں تفصیلی بحثیں کی ہیں۔ مثلاً ایک بحث یہ ہے کہ کسی فعل کے مباح ہونے کے کیا قرائن اور دلائل ہوتے ہیں۔ اس بارے میں الدکتور عبدالکریم زیدان نے 'الوجیز' میں عمدہ بحث کی ہے۔ امام شاطبیؒ بھی 'الموافقات' میں مباح کے حوالے سے بڑی نفیس ابحاث لے کر آئے ہیں۔ مثلاً امام شاطبیؒ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات ایک مباح فعل فرض یا مستحب بھی بن جاتا ہے اور بعض اوقات مکروہ یا حرام بھی۔ مثلاً قرآن میں ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا﴾ کا حکم ہے جو کہ اباحت کے لیے ہے، یعنی جو چاہے کھانا کھائے اور جو چاہے نہ کھائے، لیکن اگر کوئی شخص مستقل کھانا چھوڑ دے اور موت کے قریب پہنچ جائے، جیسا کہ بھوک ہڑتال میں ہوتا ہے، تو اب اس کے لیے یہی حکم (یعنی کھانا کھانے کا) فرضیت کے درجے میں ہوگا۔ اسی طرح اپنی بیوی سے مباشرت نہ کرنا ایک مباح فعل ہے، لیکن اس مباح فعل پر مداومت اس فعل کو حرمت کے درجے تک پہنچا دے گی۔

قرآن وسنت میں امر کا صیغہ ہر وقت وجوب کے معنی میں نہیں ہوتا' جیسا کہ ناواقف لوگوں کا خیال ہے۔امام سبکیؒ نے 'جمع الجوامع' میں امر کے صیغے کے ۲۶ معانی کا تذکرہ کیا ہے۔بعض اصولیین نے امر کے صیغے کے سترہ اور بعض نے سولہ معانی بھی بیان کیے ہیں۔مثلاً وجوب' ندب' اباحت' تہدید' ارشاد' تأدیب' انذار' امتنان' اکرام' امتہان' تکوین' تعجیز' اہانت' تسویہ' دعا' تمنی' احتقار' خبر' اعتبار' تعجب' تکذیب' مشورہ' ارادہ' امتثال' اذن' انعام اور تفویض وغیرہ۔اصولیین نے امر کے یہ تمام معانی قرآن وسنت کی نصوص سے ثابت کیے ہیں۔طوالت کے خوف سے ہم ان تمام نصوص کو بیان نہیں کر رہے۔مثال کے طور پر ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ میں امر کا صیغہ دعا کے معنی میں ہے' ﴿ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ﴾ (الدُّخان) میں اہانت کے لیے ہے اور ﴿اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ﴾ (حٰمٓ السجدۃ: ٤٠) میں تہدید کے لیے ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی وہ سنن جو کسی فعل کی اباحت سے متعلق ہیں' ان سنن پر عمل یا ان کی ترغیب وتشویق دین اسلام کا مطلوب ومقصود نہیں ہے' سوائے اس کے کہ وہ مباح استحباب یا وجوب کے درجے کو پہنچ جائے' جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

(٤) بعض اوقات آپ ﷺ کے قول سے کسی فعل کی کراہت ثابت ہوتی ہے۔حضرت ابو ہریرہ h فرماتے ہیں کہ آپ ؐ کا فرمان ہے:

((لَا يَمْشِ اَحَدُكُمْ فِيْ نَعْلٍ وَاحِدَةٍ)) (٥٢)

''تم میں سے کوئی شخص ایک جوتے میں نہ چلے''۔

اس حدیث میں آپ ﷺ نے ایک جوتا پہن کر چلنے سے منع فرمایا' لیکن ایک جوتا پہن کر چلنا حرام نہیں ہے' بلکہ مکروہ ہے۔لہٰذا اس حدیث میں نہی کا صیغہ کراہت کے لیے ہے۔امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

يكره المشي في نعل واحدة أو خف واحد(٥٣)

''ایک جوتے یا ایک موزے میں چلنا مکروہ ہے''۔

امام ترمذیؒ نے بھی اس حدیث کو بیان کرنے کے لیے 'ما جاء في كراهية المشي في النعل الواحدة' کے الفاظ سے باب باندھ کر اس فعل کی کراہت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اسی طرح ایک اور حدیث کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعُدُوِّ وَسَلُوا اللّٰهَ الْعَافِيَةَ)) (٥٤)

''دشمن سے ملاقات کی تمنا نہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے عافیت طلب کرو''۔

اس حدیث میں دشمن سے ملاقات کی تمنا کرنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ تمنا کرنا مکروہ ہے۔جیسا کہ امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب 'كراهية تمني لقاء العدو' میں اس کی کراہت کی طرف اشارہ کیا ہے۔اسی

طرح امام نوویؒ نے 'صحیح مسلم' میں 'کراھیة تمنی لقاء العدو' اور امام ابوداؤد نے سنن ابی داؤد میں 'فی کراھیة تمنی لقاء العدو' کے عنوان سے باب باندھ کر اس فعل کی کراہت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اصولیین کی تعریف کے مطابق مکروہ سے مراد وہ فعل ہے جس کے نہ کرنے کا شارع نے حکم دیا ہو لیکن اس کے نہ کرنے کو لازم نہ ٹھہرایا ہو۔ مکروہ کو ترک کرنا اولیٰ ہے۔ الدکتور عبدلکریم زیدان مکروہ کے حکم کے بارے میں لکھتے ہیں:

و حكم المكروه أن فاعله لا يأثم و إن كان ملوما و أن تاركه يمدح و يثاب اذا كان تركه لله (۵۵)

''مکروہ کا حکم یہ ہے کہ اس کا کرنے والا گناہ گار نہ ہوگا اگر چہ اس کو ملامت کی جائے گی اور اس کا تارک قابل مدح اور ثواب کا مستحق ہے جبکہ اس نے اس فعل کو اللہ کے لیے ترک کیا ہو''۔

احناف اس مکروہ کو مکروہ تنزیہی کہتے ہیں جبکہ جمہور علماء صرف مکروہ کہتے ہیں۔ تمام ائمۂ اہل سنت کے نزدیک اس کے منکر کی تکفیر نہیں ہوگی۔ عامۃ الناس کو مکروہات سے بچنے کی ترغیب وتشویق بھی دلائی جائے گی۔

(۵) بعض اوقات رسول اللہ ﷺ کے قول سے کسی فعل کی حرمت معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً آپ ﷺ کا فرمان ہے:

((لَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَيْعِ بَعْضٍ وَلَا يَخْطُبْ بَعْضُكُمْ عَلٰى خِطْبَةِ بَعْضٍ)) (۵۶)

''تم میں سے کوئی اپنے بھائی کے سودے پر سودا نہ کرے اور نہ ہی کوئی اپنے بھائی کی منگنی پر منگنی کرے''۔

اگر کسی شخص نے بذریعہ ایجاب وقبول کوئی سودا مکمل کر لیا ہے تو اس کے اس سودے پر سودا کرنا حرام ہے۔ اسی طرح اگر کسی شخص کا کسی خاندان میں رشتہ طے ہو چکا ہو تو وہاں اپنے رشتے کی بات چلانا حرام ہے سوائے اس کے کہ پہلا شخص دوسرے کو اجازت دے دے یا وہ اس جگہ نکاح کا ارادہ ترک کر دے۔

امام نوویؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

هذه الأحاديث ظاهرة فى تحريم الخطبة على خطبة أخيه و أجمعوا على تحريمها اذكان قد صرح للخاطب بالإجابة و لم يأذن و لم يترك (۵۷)

''ان احادیث مبارکہ کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان بھائی کی منگنی پر منگنی کرنا حرام ہے اور اُمت کا اس فعل کی حرمت پر اجماع ہے جبکہ لڑکی والوں نے پیغام بھیجنے والے کے پیغام کو صراحتاً قبول کر لیا ہو اور پہلے شخص نے دوسرے کو نہ تو وہاں پیغام بھیجنے کی اجازت دی ہو اور نہ ہی اس جگہ نکاح کا ارادہ ترک کیا ہو''۔

احناف ایسے فعل کو حرام کی بجائے مکروہ تحریمی کہتے ہیں۔ جمہور اور احناف کے نزدیک اس کی تعریف ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ حرام یا مکروہ تحریمی سے مراد ایسا فعل ہے جس کے نہ کرنے کا شارع نے حکم دیا ہو اور اس کے نہ کرنے کو لازم بھی ٹھہرایا ہو۔ اس کے مرتکب کو ملامت کی جائے گی اور اس کو آخرت میں عذاب بھی ہوگا۔ احناف کے نزدیک اگر اس کا علم قطعی ذریعے یعنی قرآن، خبر متواتر یا اجماع سے ہوگا تو یہ حرام ہے اور اگر اس کا علم ظنی ذریعے یعنی خبر واحد سے ہوگا تو یہ مکروہ تحریمی ہے۔ جبکہ جمہور اسے حرام ہی کہتے ہیں چاہے قرآن سے اس کا علم حاصل ہو یا خبر واحد سے۔ ائمہ جمہور اور احناف کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ اگر کسی فعل کی حرمت بذریعہ سنت (یعنی خبر واحد) معلوم ہو اور اس سنت کا کوئی شخص انکار کر دے تو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی اگرچہ دنیا میں اس کو سخت ملامت کی جائے گی اور آخرت میں وہ عذابِ الٰہی کا مستحق ہوگا۔ الشیخ عاصم الحداد لکھتے ہیں:

''اور سب، وہ (یعنی احناف) اور دوسرے (یعنی مالکیہ، شافعیہ، حنابلہ و اہل الحدیث) یہ کہتے ہیں کہ تکفیر اس شخص کی کی جائے گی جو کسی قطعی دلیل سے ثابت چیز کا انکار کرے اور اس شخص کی تکفیر نہیں کی جائے جو کسی ظنی دلیل سے ثابت چیز کا انکار کرے۔ اسے صرف فاسق یا گمراہ قرار دیا جا سکتا ہے''۔ (۵۸)

(۶) بعض اوقات کسی مسئلے میں نبی اکرم ﷺ کا ایک قول ہوتا ہے اور ایک شخص اس قول پر عمل کرنے کو سنت پر عمل سمجھ رہا ہوتا ہے اور لوگوں کو بھی اس کی ترغیب و تشویق دلا رہا ہوتا ہے جبکہ آپ ﷺ کا وہ قول آپؐ ہی کے کسی دوسرے قول یا فعل سے منسوخ ہوتا ہے۔ عام اشخاص یا اہل علم کی بات تو کجا بعض اوقات بعض صحابہؓ کو بھی آپؐ کی کسی سنت کے نسخ کا علم نہیں ہوتا تھا اور وہ منسوخ سنت پر خود بھی عمل کر رہے ہوتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب و تشویق دلا رہے ہوتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر صحابیؓ ہر وقت آپؐ کی مجلس میں موجود نہیں ہوتا تھا اس لیے ہر صحابیؓ کو ہر حدیث کا علم بھی نہیں ہوتا تھا۔ حضرت عائشہ k فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((تَوَضَّئُوْا مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ)) (۵۹)

''جس کو آگ نے چھوا ہو اُس کے کھانے کے بعد وضو کرو''۔

اسی طرح حضرت ابو ہریرہ h فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْوُضُوْءُ مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ وَلَوْ مِنْ ثَوْرِ أَقِطٍ)) قَالَ فَقَالَ لَهُ ابْنُ عَبَّاسٍ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ أَنَتَوَضَّأُ مِنَ الدُّهْنِ؟ أَنَتَوَضَّأُ مِنَ الْحَمِيْمِ؟ قَالَ فَقَالَ أَبُوْ هُرَيْرَةَ يَا ابْنَ أَخِيْ إِذَا سَمِعْتَ حَدِيْثًا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَلَا تَضْرِبْ لَهُ مَثَلًا (۶۰)

''جس چیز کو آگ نے چھوا ہو اُس کے کھانے کے بعد وضو کرو چاہے وہ پنیر کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ

ہو‘‘۔راوی کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے دریافت کیا: کیا ہم چکناہٹ کی وجہ سے وضو کریں؟ کیا ہم گرم پانی کی وجہ سے بھی وضو کریں؟(کیونکہ گرم پانی کو بھی آگ چھوتی ہے)۔راوی کہتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے جواب میں کہا: اے میرے بھتیجے! جب تمہارے سامنے اللہ کے رسول ﷺ کی کوئی حدیث بیان کی جائے تو اس کے لیے مثالیں نہ بیان کیا کرو‘‘۔

علامہ البانیؒ نے اس روایت کو ’حسن‘ کہا ہے۔(۶۱) شیخ احمد شاکر نے اس کی سند کو ’صحیح‘ کہا ہے۔(۶۲)

اصل مسئلہ یہ ہے کہ شروع میں اللہ کے رسول ﷺ نے آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے کے بعد وضو کا حکم دیا تھا۔ بعد میں آپؐ نے ہی اس کو منسوخ کر دیا اور اس نسخ کا علم بعض صحابہؓ کو نہ ہوا‘ لہٰذا وہ اس منسوخ سنت پر خود بھی عمل کرتے رہے اور دوسروں کو بھی اس کا حکم جاری کرتے رہے۔حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے:

كَانَ آخِرُ الْاَمْرَيْنِ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ تَرْكُ الْوُضُوْءِ مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ(۶۴)

’’دونوں باتوں میں سے آخری بات جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے وہ ایسی چیزوں کے کھانے کے بعد وضو نہ کرنا ہے جنہیں آگ نے چھوا ہو‘‘

امام نوویؒ نے اس حدیث کی سند کو ’صحیح‘ کہا ہے۔(۶۴) امام ابن حجرؒ نے اس کو ’حسن‘ کہا ہے۔(۶۵) امام ابن الملقنؒ نے اس روایت کو ’صحیح‘ کہا ہے۔(۶۶) امام طحاویؒ نے بھی ’صحیح‘ کہا ہے۔(۶۷) امام ابن حزمؒ نے اس کو ’قابل حجت‘ قرار دیا ہے۔(۶۸) ابن قدامہؒ نے اس روایت کو ’ضعیف‘ کہا ہے۔(۶۹)

یہ روایت صحیح ہے اور جمہور صحابہؓ تابعینؒ اور ائمہ کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کے استعمال کے بعد وضو کرنا واجب نہیں ہے۔صحابہؓ میں حضرت ابو بکرؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت ابوامامہؓ حضرت عامر بن ربیعہؓ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ حضرت جابر بن عبداللہ j اور تابعینؒ میں حضرت عبیداللہ السلمانیؒ حضرت سالم بن عبداللہؒ حضرت قاسم بن محمد n اور فقہائے اہل مدینہ اور ائمہ میں امام مالکؒ امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ امام ابوحنیفہؒ امام اسحاق بن راھویہؒ امام عبداللہ بن مبارکؒ امام سفیان ثوری n‘ اہل کوفہ اور اہل حجاز کا موقف یہی ہے۔جبکہ صحابہؓ اور تابعین کی ایک جماعت آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو کے وجوب کی قائل ہے۔تفصیل کے لیے امام نووی کی ’شرح مسلم‘ اور امام عبدالرحمٰن مبارکپوری کی ’تحفۃ الاحوذی‘ کا مطالعہ مفید رہے گا۔اس بحث سے مقصود یہ ہے کہ حدیث کی کتابوں میں ایک حدیث پڑھ کر اس پر عمل یا اس کی ترغیب وتشویق شروع نہیں کر دینی چاہیے‘ بلکہ علماء سے پوچھ پوچھ کر عمل کرنا چاہیے۔

(۷) بعض اوقات نبی کریم ﷺ کا کوئی حکم تدبیری امور سے متعلق ہوتا ہے۔آپؐ کے ایسے اقوال

بھی سنت نہیں ہیں۔حضرت رافع بن خدیج h سے مروی ہے:

قَدِمَ نَبِیُّ اللّٰہِ ﷺ الْمَدِیْنَۃَ وَھُمْ یَأْبُرُوْنَ النَّخْلَ یَقُوْلُوْنَ یُلَقِّحُوْنَ النَّخْلَ فَقَالَ: ((مَا تَصْنَعُوْنَ؟)) قَالُوْا کُنَّا نَصْنَعُہُ قَالَ: ((لَعَلَّکُمْ لَوْ لَمْ تَفْعَلُوْا کَانَ خَیْرًا)) فَتَرَکُوْہُ فَنَفَضَتْ [أَوْ فَنَقَصَتْ] قَالَ فَذَکَرُوْا ذٰلِکَ لَہُ فَقَالَ: ((إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ إِذَا أَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ مِنْ دِیْنِکُمْ فَخُذُوْا بِہٖ وَإِذَا أَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ مِنْ رَأْیٍ فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ؟)) (۷۰)

''اللہ کے نبی ﷺ مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ کھجور کی پیوند کاری کرتے تھے اور وہ کہتے تھے اس طرح فصل زیادہ ہوتی ہے۔آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا:''تم یہ کیا کرتے ہو؟''انہوں نے کہا: ہم عرصہ دراز سے ایسا ہی کرتے چلے آئے ہیں۔آپؐ نے فرمایا:''شاید کہ تم ایسا نہ کرو تو بہتر ہو''۔ چنانچہ صحابہؓ نے اگلی فصل میں ایسا نہ کیا جس سے پھل کم ہو گیا۔صحابہؓ نے آپؐ سے اس بات کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا:''سوائے اس کے نہیں کہ میں تو ایک انسان ہوں۔جب میں تمہیں تمہارے دین سے متعلق کوئی حکم دوں تو تم اسے مضبوطی سے پکڑ لو اور جب میں تمہیں اپنی ذاتی رائے سے کوئی حکم جاری کروں تو میں بھی ایک انسان ہوں''۔

یہ حدیث اس مسئلے میں نص صریح ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے بعض احکامات تشریع کے لیے نہ تھے۔جیسے کسی مسئلے میں آپؐ نے بعض صحابہؓ کو دنیاوی امور میں کوئی مشورہ دے دیا ہو یا ان کی رہنمائی کر دی ہو۔

(۸) بعض اوقات رسول اللہ ﷺ کے احکامات سفارش کی قبیل سے ہوتے ہیں۔یہ بھی اُمت کے لیے شریعت نہیں ہیں۔مثلاً روایات میں آتا ہے کہ حضرت بریرہؓ حضرت عائشہؓ کی لونڈی تھیں جو ایک غلام حضرت مغیثؓ کے نکاح میں تھیں۔بعدازاں ایک موقع پر حضرت عائشہؓ نے حضرت بریرہؓ کو آزاد کر دیا۔شرعی مسئلہ یہ ہے کہ اگر عورت آزاد ہو جائے تو اسے یہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے کہ اپنی غلامی کی حالت میں کیے ہوئے نکاح کو برقرار رکھے یا توڑ دے۔حضرت بریرہؓ نے اپنی آزادی کے بعد اپنے اس اختیار کو استعمال کرتے ہوئے حضرت مغیثؓ کے نکاح میں رہنے سے انکار کر دیا۔اس پر حضرت مغیثؓ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آئے اور آپؐ سے درخواست کی کہ آپؐ بریرہؓ کو سمجھائیں۔تو آپؐ نے حضرت بریرہؓ کو بلوا کر کہا:

((یَا بَرِیْرَۃُ اتَّقِی اللّٰہَ فَإِنَّہٗ زَوْجُکِ وَأَبُوْ وَلَدِکِ)) فَقَالَتْ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ اَتَاْمُرُنِیْ بِذٰلِکَ؟ قَالَ: ((لَا، إِنَّمَا اَنَا شَافِعٌ)) فَکَانَ دُمُوْعُہٗ تَسِیْلُ عَلٰی خَدِّہٖ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لِلْعَبَّاسِ: ((أَلَا تَعْجَبُ مِنْ حُبِّ مُغِیْثٍ بَرِیْرَۃَ وَبُغْضِھَا إِیَّاہُ؟)) (۷۱)

''اے بریرہؓ! اللہ سے ڈر،وہ تیرا شوہر ہے اور تیرے بچے کا باپ ہے۔تو حضرت بریرہؓ نے کہا:اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپؐ مجھے مغیثؓ کی طرف لوٹ جانے کا حکم دے رہے ہیں؟ تو آپؐ نے فرمایا:''نہیں،میری حیثیت تو ایک سفارشی کی ہے''۔حضرت مغیثؓ کی حالت یہ تھی کہ (وہ مدینہ کی

گلیوں میں حضرت بریرہؓ کے پیچھے پھرتے تھے اور) ان کے گالوں پر ہر وقت آنسو بہتے رہتے تھے۔ تو اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت عباسؓ سے فرمایا: ''کیا تجھے تعجب نہیں ہوتا کہ مغیثؓ کو بریرہؓ سے کتنی محبت ہے اور بریرہؓ کو مغیثؓ سے کس قدر نفرت ہے؟''

امام ابن حزمؒ نے اس روایت کو 'قابل حجت' قرار دیا ہے۔(۷۲) امام ابن تیمیہؒ نے اس کو 'صحیح' کہا ہے۔(۷۳) علامہ البانیؒ نے اس کو 'صحیح' کہا ہے۔(۷۴) شیخ احمد شاکر نے بھی اس کی سند کو 'صحیح' کہا ہے۔(۷۵)

اس حدیث سے بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ کا ہر حکم ماننا واجب ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت بریرہؓ آپؐ سے یہ سوال نہ کرتیں کہ کیا آپؐ مجھے حکم دے رہے ہیں؟ ہمارے خیال میں یہ استدلال درست نہیں ہے' بلکہ یہ صریح نصوص کے خلاف ہے' جیسا کہ تأبیر نخل والی روایت میں ہے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے جب ایک دفعہ صحابہؓ کو راستوں میں بیٹھنے سے منع کیا تو صحابہؓ نے آپؐ کا یہ حکم نہ مانا' کیونکہ صحابہؓ کے نزدیک یہ کوئی شرعی حکم نہ تھا' بلکہ اس حدیث سے تو اس کے برعکس حکم معلوم ہوتا ہے' کیونکہ جب اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت بریرہؓ کو کہا کہ اللہ سے ڈرو تو حضرت بریرہؓ کو آپؐ سے سوال ہی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ حضرت بریرہؓ کا آپؐ کے الفاظ 'اِتَّقِی اللّٰہَ' کے باوجود آپؐ سے سوال کرنا کہ کیا آپؐ مجھے حکم دے رہے ہیں' یہ واضح کرتا ہے کہ آپؐ کا ہر حکم شرعی نہیں ہوتا۔ لہٰذا آپؐ کے ایسے احکامات جو کہ مشورے کی قبیل سے ہوں' ان کا انکار' انکارِ سنت نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ایسی سنن کی اتباع بھی لازم نہیں ہے۔

(۹) بعض اوقات آپ ﷺ کے احکامات قضاء سے متعلق ہوتے ہیں۔ آپؐ کے ایسے احکامات بھی سنت یعنی مصدر شریعت نہیں ہیں۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِنَّکُمْ تَخْتَصِمُوْنَ إِلَیَّ وَلَعَلَّ بَعْضَکُمْ اَلْحَنُ بِحُجَّتِهٖ مِنْ بَعْضٍ فَمَنْ قَضَیْتُ لَهٗ بِحَقِّ أَخِیْهِ شَیْئًا بِقَوْلِهٖ فَإِنَّمَا أَقْطَعُ لَهٗ قِطْعَةً مِنَ النَّارِ فَلَا یَأْخُذْهَا))(۷۶)

''تم میں سے بعض لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہیں' اور شاید تم میں سے کوئی ایک زیادہ چرب زبان واقع ہو۔ پس اگر میں کسی ایک شخص کو اس کی چرب زبانی کی وجہ سے اس کے بھائی کے حق میں سے دے دوں' تو ایسے شخص کو میں آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں' پس وہ اس کو نہ لے''۔

(۱۰) بعض اوقات آپ ﷺ کے احکامات کسی ایک شخص کے بارے میں خاص ہوتے ہیں' لہٰذا تمام اُمت کے لیے وہ سنت نہیں ہوتے۔ مثلاً ایک روایت کے الفاظ ہیں:

ذَبَحَ أَبُوْ بُرْدَةَ قَبْلَ الصَّلَاةِ فَقَالَ لَهُ النَّبِیُّ ﷺ: ((أَبْدِلْهَا)) قَالَ لَیْسَ عِنْدِیْ اِلَّا جَذَعَةٌ [قَالَ شُعْبَةُ وَأَحْسِبُهٗ قَالَ: هِیَ خَیْرٌ مِنْ مُسِنَّةٍ] قَالَ : ((اِجْعَلْهَا مَکَانَهَا وَلَنْ تَجْزِیَ عَنْ أَحَدٍ بَعْدَکَ))(۷۷)

''حضرت ابو بردہؓ نے نماز عید سے پہلے قربانی کر لی تو اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے فرمایا: ''تم اس کے بدلے میں ایک اور قربانی کرو''۔ تو انہوں نے جواباً کہا: میرے پاس تو صرف ایک جذعہ (بکری) ہے۔ [حدیث کے راوی شعبہ کہتے ہیں کہ میرے خیال میں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ (یعنی جذعہ) دوندے سے بہتر حالت میں ہے] تو آپؐ نے فرمایا: ''اس کے بدلے میں جذعہ (بکری) قربانی کے طور پر دے دو' لیکن یہ (یعنی جذعہ بکری) تیرے بعد کسی کو (بطور قربانی) کفایت نہیں کرے گی (یعنی بکری کے لیے دو دانتا ہونا ضروری ہے)''۔

اسی طرح آپ ﷺ کے بعض احکامات کے بارے میں صحابہؓ میں اختلاف بھی ہو جاتا تھا کہ وہ عام ہیں یا خاص۔ مثلاً آپؐ کے ایک صحابی حضرت ابو حذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالمؓ ان کے ساتھ ہی ان کے گھر میں رہتے تھے' لیکن یہ ابھی بالغ نہیں ہوئے تھے۔ جب یہ بالغ ہو گئے تو حضرت ابو حذیفہؓ کو اُن کا اپنے گھر میں آنا جانا اور رہنا پسند نہ تھا' اس پر ان کی بیوی حضرت سہلہ بنت سہیلؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس مسئلے کا حل دریافت فرمایا تو آپؐ نے ان صحابیہؓ کو مشورہ دیا:

((أَرْضِعِيْهِ)) قَالَتْ وَكَيْفَ أُرْضِعُهُ وَهُوَ رَجُلٌ كَبِيْرٌ؟ فَتَبَسَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَقَالَ: ((قَدْ عَلِمْتُ أَنَّهُ رَجُلٌ كَبِيْرٌ))(۷۸)

''اس (یعنی سالمؓ) کو دودھ پلا دو'' تو حضرت سہلہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں اسے کیسے دودھ پلاؤں جبکہ وہ ایک بالغ لڑکا ہے؟ تو اللہ کے رسول ﷺ مسکرائے اور فرمایا: ''میں جانتا ہوں کہ وہ ایک بالغ لڑکا ہے''۔

حضرت عائشہ k اس حدیث کے حکم کو صرف ان صحابیہؓ کے ساتھ خاص نہیں سمجھتی تھیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

فَبِذٰلِکَ كَانَتْ عَائِشَةُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا تَأْمُرُ بَنَاتِ اَخَوَاتِهَا وَبَنَاتِ إِخْوَتِهَا أَنْ يُرْضِعْنَ مَنْ اَحَبَّتْ عَائِشَةُ اَنْ يَرَاهَا وَيَدْخُلَ عَلَيْهَا وَاِنْ كَانَ كَبِيْرًا خَمْسَ رَضَعَاتٍ ثُمَّ يَدْخُلُ عَلَيْهَا وَاَبَتْ أُمُّ سَلَمَةَ وَسَائِرُ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ أَنْ يُدْخِلْنَ عَلَيْهِنَّ بِتِلْکَ الرَّضَاعَةِ اَحَدًا مِنَ النَّاسِ حَتّٰى يَرْضَعَ فِي الْمَهْدِ وَقُلْنَ لِعَائِشَةَ وَاللّٰهِ مَا نَدْرِيْ لَعَلَّهَا كَانَتْ رُخْصَةً مِنَ النَّبِيِّ ﷺ لِسَالِمٍ دُوْنَ النَّاسِ(۷۹)

''اسی حدیث کی وجہ سے حضرت عائشہ k اپنی بھانجیوں اور بھتیجیوں کو حکم دیتی تھیں کہ وہ اس کو پانچ مرتبہ دودھ پلائیں جس کے بارے میں حضرت عائشہؓ کو یہ پسند ہوتا تھا کہ وہ ان کو دیکھے اور ان کے پاس آئے اگرچہ وہ بڑا ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اُم سلمہؓ اور باقی تمام ازواج مطہرات نے اس بات سے انکار کر دیا کہ کوئی شخص اس طرح (بڑی عمر میں) ان کا رضاعی رشتہ دار بنے اور پھر اس کے لیے ازواج

مطہرات کے پاس آنا جائز ہو۔ یہ تمام ازواج گود کی (حالت میں) رضاعت کی وجہ سے اپنے ساتھ رضاعی رشتہ داری کو جائز قرار دیتی تھیں۔ یہ ازواج حضرت عائشہؓ کو کہتی تھیں کہ اللہ کی قسم! ہم تو یہی سمجھتی ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کا یہ حکم صرف حضرت سالمؓ کے لیے تھا نہ کہ تمام لوگوں کے لیے''۔

علامہ البانیؒ نے اس روایت کو 'صحیح' کہا ہے۔(۸۰) امام ابوداؤد کے نزدیک بھی یہ روایت 'صالح' ہے۔

(۱۱) بعض اوقات آپ ﷺ کے احکامات 'سدًّا للذریعة' ہوتے ہیں۔ یعنی آپؐ کوئی حکم بطور شریعت جاری نہیں کرتے بلکہ کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی کی طرف لے جانے والے کسی سبب اور ذریعے سے منع کرتے ہیں' حالانکہ وہ سبب اور ذریعہ بذاتہ شرعاً جائز ہوتا ہے۔ آپؐ کے ایسے احکامات کی اتباع بھی ضروری نہیں ہے۔ مثلاً ایک دفعہ آپؐ نے صحابہؓ کو حکم دیا:

((إِيَّاكُمْ وَالْجُلُوْسَ فِي الطُّرُقَاتِ)) قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَالَنَا بُدٌّ مِنْ مَجَالِسِنَا' نَتَحَدَّثُ فِيْهَا' فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((فَإِذَا أَبَيْتُمْ إِلَّا الْمَجْلِسَ فَأَعْطُوا الطَّرِيْقَ حَقَّهُ)) قَالُوْا وَمَا حَقُّهُ؟ قَالَ: ((غَضُّ الْبَصَرِ وَكَفُّ الْاَذٰى وَرَدُّ السَّلَامِ وَالْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ))(۸۱)

''راستوں میں بیٹھنے سے بچو''۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ہمارے لیے راستوں میں بیٹھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے' ہم یہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''جب تم نے میری بات سے انکار کر دیا اور بیٹھنے کی بات کی ہے تو پھر راستے کو اس کا حق دو''۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ راستے کا حق کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''نظر کو جھکا کر رکھنا' کسی کو تکلیف دینے سے بچنا (تکلیف دہ چیز دور کرنا)' سلام کا جواب دینا' معروف کا حکم دینا اور منکر سے منع کرنا''۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ صحابہؓ کو معلوم تھا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا یہ حکم کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ کے رسول ﷺ نے بھی صحابہؓ کے انکار پر ان پر کوئی دباؤ نہ ڈالا' بلکہ ان کو جس سبب سے یہ حکم جاری کیا تھا اس کی وضاحت کر دی' یعنی راستوں میں بیٹھو لیکن ان کا حق ادا کرو۔ گویا مطلق راستے میں بیٹھنے سے منع کرنا آپؐ کا مقصود نہ تھا' بلکہ آپؐ نے یہ حکم کسی سبب سے جاری کیا تھا اور وہ سبب یہ تھا کہ راستوں میں بیٹھنا لوگوں کو اذیت دینے اور بے حیائی کی طرف لے جانے کا باعث بن سکتا ہے۔

(۱۲) بعض اوقات رسول اللہ ﷺ کسی وقتی ضرر کو دور کرنے اور جزئی مصلحت کے حصول کے لیے کوئی حکم جاری کرتے تھے۔ مثلاً اللہ کے رسول ﷺ نے ایک دفعہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر صحابہؓ کو حکم دیا کہ وہ قربانی کے جانوروں کا گوشت تین دن سے زائد استعمال نہ کریں۔ بعض صحابہؓ نے اس حکم کو آپ ﷺ کا ایک مستقل حکم سمجھ لیا' حالانکہ آپؐ نے یہ حکم ان غریب بدو صحابہؓ کی وجہ سے جاری کیا تھا جو اُس عید کے

موقع پر آپؐ کے ساتھ حاضر تھے۔ اور اللہ کے رسول ﷺ کا اپنے اس حکم سے مقصود یہ تھا کہ لوگ قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنے کی بجائے ان بدو صحابہؓ پر صدقہ کر دیں۔ حضرت سالمؒ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے نقل کرتے ہیں:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى اَنْ تُؤْكَلَ لُحُوْمُ الْاَضَاحِيُ بَعْدَ ثَلَاثٍ ، قَالَ سَالِمٌ فَكَانَ ابْنُ عُمَرَ لَا يَاْكُلُ لُحُوْمَ الْاَضَاحِيُ فَوْقَ ثَلَاثٍ(۸۲)

''اللہ کے رسول ﷺ نے قربانی کا گوشت تین دن کے بعد کھانے سے منع کر دیا۔ حضرت سالمؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ تین دن کے بعد قربانی کا گوشت نہ کھاتے تھے''۔

حضرت علیؓ کا بھی یہی موقف تھا، جیسا کہ امام نوویؒ نے 'شرح مسلم' میں بیان کیا ہے۔ جبکہ باقی صحابہؓ اس حکم کو ایک مستقل حکم نہیں مانتے اور جمہور علماء کا بھی یہی موقف ہے۔ اسی لیے حضرت عائشہؓ سے جب اس بارے میں سوال ہوا تو انہوں نے کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک سال بدو صحابہؓ کی وجہ سے تین دن سے زائد قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنے سے منع کیا تھا تاکہ لوگ اس کو صدقہ کریں، لیکن اگلے سال آپؐ نے لوگوں کو تین دن سے زائد بھی قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنے کی اجازت دے دی۔ روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّمَا نَهَيْتُكُمْ مِنْ أَجْلِ الدَّافَّةِ الَّتِيْ دَفَّتْ، فَكُلُوْا وَادَّخِرُوْا وَتَصَدَّقُوْا))(۸۳)

''میں نے تم کو تین دن کے بعد قربانی کا گوشت کھانے سے بعض بدو صحابہؓ کی وجہ سے منع کیا تھا جو کہ ہمارے پاس آ گئے تھے۔ اب تم تین دن کے بعد بھی کھاؤ، ذخیرہ کرو اور صدقہ بھی کرو''۔

اسی طرح صحیحین میں ایک روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے صحابہؓ کو کتوں کو قتل کرنے کا حکم دیا اور صحابہؓ نے اس پر عمل بھی کیا، یہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ مدینہ کے قرب و جوار میں ہم نے کوئی کتا نہ چھوڑا۔ اسی حدیث کی بنیاد پر مالکیہ کے نزدیک کتوں کو قتل کرنا ایک شرعی حکم ہے جو کہ اب بھی جاری ہے، جبکہ شوافع کے نزدیک یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے اور اس کی دلیل صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ کی روایت ہے، جس کے مطابق آپؐ نے بعد میں کتوں کو قتل کرنے سے منع کر دیا تھا۔ محسوس یہی ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک خاص وقت میں مدینہ اور اس کے اردگرد کے کتوں کو قتل کرنے کا جو حکم دیا وہ نہ تو کوئی شرعی حکم تھا اور نہ وہ منسوخ ہوا، بلکہ آپؐ کے زمانے میں پاگل کتوں کی تعداد بڑھ گئی جس کی وجہ سے آپؐ نے صحابہؓ کو کتوں کو مارنے کا حکم دیا تاکہ مسلمانوں کو ضرر سے بچایا جا سکے۔ بعد میں جب کافی تعداد میں کتے مارے گئے تو آپؐ نے صحابہؓ کو مزید کتوں کو مارنے سے منع کر دیا۔ لہٰذا اللہ کے رسول ﷺ کا اصل مقصود مسلمانوں کو ضرر سے بچانا تھا نہ کہ کوئی شرعی حکم جاری کرنا اور پھر اس کو منسوخ کرنا۔ جیسا کہ ایک صحیح روایت سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے حدودِ حرم میں جن پانچ چیزوں کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے ان

میں ایک 'الکلب العقور' یعنی پاگل کتا بھی ہے۔

(۱۳) بعض اوقات رسول اللہ ﷺ کے احکامات بظاہر مطلق ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ مطلق نہیں ہوتے۔ ایسے احکامات اپنے اطلاق میں سنت نہیں ہوں گے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں کہ:

كَانَتْ تَحْتِي امْرَاَةٌ اُحِبُّهَا وَكَانَ اَبِيْ يَكْرَهُهَا' فَاَمَرَنِيْ اَبِيْ اَنْ اُطَلِّقَهَا' فَاَبَيْتُ' فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ : ((يَا عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ طَلِّقِ امْرَاَتَكَ))[۸۴]

''ایک خاتون میرے نکاح میں تھیں اور مجھے اس سے محبت تھی' لیکن میرے والد (یعنی حضرت عمرؓ) کو وہ خاتون ناپسند تھیں' تو میرے والد نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کو طلاق دے دوں۔ میں نے انکار کر دیا۔ پھر میں نے اللہ کے نبی ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''اے عبداللہ بن عمر! اپنی بیوی کو طلاق دے دو''۔

اس روایت کو امام ترمذیؒ نے 'حسن صحیح' کہا ہے۔[۸۵] امام ابن العربی نے 'صحیح' اور 'ثابت' کہا ہے۔[۸۶] علامہ البانیؒ نے 'حسن' کہا ہے۔[۸۷] شیخ احمد شاکر نے اس کی سند کو 'صحیح' کہا ہے۔[۸۸]

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ اس بارے میں اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر i کو کہا: ((أَطِعْ أَبَاكَ))[۸۹] یعنی اپنے باپ کی اطاعت کر۔ اب اس روایت سے یہ مسئلہ نکالنا کہ اگر باپ اپنے بیٹے کو یہ حکم دے کہ اپنی بیوی کو طلاق دو تو اس مسئلے میں باپ کی اطاعت مطلقاً واجب ہے' درست نہیں ہے۔ 'تحفۃ الاحوذی' اور 'نیل الاوطار' کے مصنفین نے اس حدیث کو دلیل بناتے ہوئے لکھا ہے کہ باپ کے حکم پر بیٹے کے لیے واجب ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے چاہے کوئی شرعی عذر ہو یا نہ ہو اور اگر ماں بیوی کو طلاق کا حکم دے تو تین گنا زیادہ واجب ہے' کیونکہ حدیث میں ماں کا حق تین گنا زیادہ بیان کیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ موقف درست نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس دو بدو آئے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں اپنے اونٹ کی تلاش میں ایک قبیلے میں جا نکلا اور وہاں ایک لڑکی مجھے پسند آ گئی تو میں نے اس سے شادی کر لی' لیکن میرے والدین نے قسم اٹھا کر یہ بات کی ہے کہ وہ اس لڑکی کو اپنے خاندان میں شامل نہیں کریں گے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس بدو سے کہا:

مَا اَنَا بِالَّذِيْ آمُرُكَ اَنْ تُطَلِّقَ امْرَاَتَكَ وَلَا اَنْ تَعُقَّ وَالِدَيْكَ ' قَالَ فَمَا أَصْنَعُ بِهٰذِهِ الْمَرْاَةَ؟ قَالَ ابْرُرْ وَالِدَيْكَ[۹۰]

''میں تمہیں نہ تو یہ حکم دیتا ہوں کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دو اور نہ ہی یہ مشورہ کہ تم اپنے والدین کی نافرمانی کرو۔ تو وہ شخص کہنے لگا کہ میں پھر اس عورت کا کیا کروں؟ تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا: اپنے والدین سے حسن سلوک کرو''۔

اسی طرح حضرت ابودرداء h کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میرا باپ پہلے مجھے ایک لڑکی کے ساتھ شادی پر مجبور کرتا رہا اور جب میں نے اس سے شادی کر لی تو اب مجھے حکم دیتا ہے کہ میں اسے طلاق دے دوں۔ تو حضرت ابودرداءؓ نے کہا:

مَا أَنَا بِالَّذِیْ آمُرُکَ أَنْ تَعُقَّ وَالِدَکَ وَلَا أَنَا بِالَّذِیْ آمُرُکَ اَنْ تَعُقَّ امْرَاَتَکَ غَیْرَ إِنَّکَ إِنْ شِئْتَ حَدَّثْتُکَ مَا سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ : ((اَلْوَالِدُ أَوْسَطُ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ فَحَافِظْ عَلٰی ذٰلِکَ إِنْ شِئْتَ أَوْ دَعْ))(۹۱)

''میں تمہیں نہ تو یہ حکم دیتا ہوں کہ تم اپنے والدین کی نافرمانی کرو اور نہ ہی یہ مشورہ کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دو۔ ہاں اگر تم چاہو تو میں تمہیں اللہ کے رسول ﷺ کی ایک حدیث بیان کر دیتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''باپ جنت کے دروازوں میں سے درمیانی دروازہ ہے۔ اگر تو چاہے تو اس کی حفاظت کر اور اگر چاہے تو اس کو چھوڑ دے''۔

علامہ البانیؒ نے اس حدیث کو 'صحیح' کہا ہے۔(۹۲)

اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ سے جب اس مسئلے کے بارے میں سوال ہوتو آپؒ نے سائل سے کہا: اپنی بیوی کو طلاق مت دے۔ اس پر سائل نے جواباً حضرت عبداللہ بن عمرؓ والا مذکورہ بالا واقعہ سنا دیا تو امام احمدؒ نے جواب دیا:

إِذَا کَانَ أَبُوْکَ مِثْلَ عُمَرَ فَطَلِّقْهَا(۹۳)

''اگر تیرا باپ بھی حضرت عمرؓ کی طرح ہے تو اپنی بیوی کو طلاق دے دے''۔

سعودی علماء کی کمیٹی 'فتاوی اللجنة الدائمة' سے جب اس بارے میں سوال ہوا تو علماء نے یہ جواب دیا:

علیک إقناع والدک بعدم طلق زوجتک' فإن أصر وجب علیک أن تطلقها إذا کان ذلک لأمر شرعی' أما إن کان أمره بطلاقها بغیر مسوغ شرعی فإنه لا یلزمک طاعته فی ذلک؛ لقول النبی ﷺ : ((إِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوْفِ))(۹۴)

''تمہارے لیے لازم ہے کہ اپنے والدین کی بات نہ مانو اور بیوی کو طلاق نہ دو' لیکن اگر والدین بیوی کو طلاق دینے پر اصرار کریں اور کسی شرعی عیب کی وجہ سے یہ حکم دے رہے ہوں تو ان کی بات مان لو۔ لیکن اگر کسی شرعی سبب کے بغیر طلاق کا حکم دیں تو ان کی اطاعت لازم نہیں ہے' کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ ''اطاعت صرف معروف میں ہے''۔

اسی طرح داڑھی کے بارے میں بعض روایات میں 'أَعْفُوا اللِّحٰی' اور 'وَفِّرُوا اللِّحٰی' اور 'أَرْخُوا اللِّحٰی' کے جو الفاظ آئے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ امر مطلق ہے؟ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ ان احادیث میں امر کا صیغہ وجوب کے لیے ہے' لیکن کیا مطلق طور پر داڑھی کو چھوڑنا واجب ہے یا کسی حد تک

چھوڑنا واجب ہے؟ بعض علماء کے نزدیک داڑھی کو اس کی حالت پر چھوڑنا واجب ہے اور اس میں سے کچھ بھی کتر بیونت جائز نہیں ہے۔ علماء کی یہ جماعت آپ ﷺ کے حکم کو اس کے اطلاق پر باقی رکھتی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ کے فعل سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے اپنی داڑھی کی کبھی تراش خراش نہیں کی، لیکن بعض صحابہؓ سے ملتا ہے کہ انہوں نے ایک مشت سے زائد اپنی داڑھی کی تراش خراش کی ہے، جس سے ثابت ہوا کہ ان صحابہؓ کے نزدیک آپ ﷺ کا داڑھی رکھنے کا حکم تو وجوب کے لیے تھا لیکن وہ حکم اپنے اطلاق میں واجب نہ تھا۔ حضرت نافعؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا:

((خَالِفُوا الْمُشْرِكِيْنَ وَفِّرُوا اللِّحٰى وَاحْفُوا الشَّوَارِبَ)) وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا حَجَّ أَوِ اعْتَمَرَ قَبَضَ عَلٰى لِحْيَتِهٖ فَمَا فَضُلَ أَخَذَهٗ[۹۵]

''مشرکین کی مخالفت کرو، داڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں کم کرو''۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب حج یا عمرہ کرتے تھے تو اپنی داڑھی کو مٹھی میں لیتے تھے اور جو بال مٹھی سے زائد ہوتے تھے ان کو کاٹ دیتے تھے''۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کو مطلقاً واجب نہ سمجھتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک اور شخص کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کیا، یعنی اس کی داڑھی کی تراش خراش کی۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی داڑھی کی تراش خراش ثابت ہے۔ اس کی تفصیل 'فتح الباری' میں موجود ہے۔ سنن ابی داؤد کی ایک 'حسن' روایت کے مطابق حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ ہم (یعنی صحابہؓ) حج اور عمرہ کے علاوہ داڑھی چھوڑے رکھتے تھے، یعنی حج اور عمرہ کے موقع پر ہم داڑھی کی تراش خراش کر لیتے تھے۔

(۱۴) بعض اوقات بعض مخصوص حالات میں اللہ کے رسول ﷺ کے حکم پر عمل کرنے میں کسی فتنے کا اندیشہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے بعض علماء کے نزدیک ان حالات میں آپؐ کے اس حکم پر عمل کرنا سنت پر عمل شمار نہیں ہوتا۔ مثلاً آپ ﷺ کا حکم ہے:

((لَا تَمْنَعُوْا إِمَاءَ اللّٰهِ مَسَاجِدَ اللّٰهِ)) [۹۶]

''اللہ کی بندیوں (یعنی اپنی بیویوں) کو مسجدوں میں جانے سے مت روکو''۔

اللہ کے رسول ﷺ کے اس فرمان کے باوجود حضرت عمرؓ اپنی بیوی کے مسجد جانے کو ناپسند کرتے تھے اور بعض اوقات اس کا اظہار بھی کر دیتے تھے۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کی بیوی سے کہا گیا:

لِمَ تَخْرُجِيْنَ وَقَدْ تَعْلَمِيْنَ أَنَّ عُمَرَ يَكْرَهُ ذٰلِكَ وَيَغَارُ؟[۹۷]

''آپ مسجد کے لیے گھر سے کیوں نکلتی ہیں جبکہ آپ جانتی ہیں کہ حضرت عمرؓ اس کو ناپسند کرتے ہیں اور اس بات پر غیرت کھاتے ہیں؟''

اسی طرح حضرت عائشہ k نے جب اپنے زمانے کے فتن کو دیکھا تو کہا:

لَوْ أَدْرَکَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَا أَحْدَثَ النِّسَاءُ لَمَنَعَهُنَّ کَمَا مُنِعَتْ نِسَاءُ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ (۹۸)

''اگر اللہ کے رسول ﷺ آج کل کی عورتوں کے حالات دیکھتے تو عورتوں کو مسجد میں جانے سے روک دیتے جیسے کہ بنی اسرائیل کی عورتوں کو روک دیا گیا تھا''۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر i نے جب اپنے بیٹے بلالؒ کو اللہ کے رسول ﷺ کی یہ روایت سنائی کہ اپنی بیویوں کو مسجد میں جانے سے نہ روکو تو حضرت بلالؒ نے جواباً کہا:

وَاللّٰهِ لَنَمْنَعُهُنَّ، فَقَالَ لَـهُ عَبْدُ اللّٰهِ أَقُوْلُ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَتَقُوْلُ اَنْتَ لَنَمْنَعُهُنَّ؟ (۹۹)

''اللہ کی قسم ہم تو اِن کو منع کریں گے''۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا: ''میں تم سے اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث بیان کرتا ہوں اور تم کہتے ہو کہ ہم منع کریں گے؟''

بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت بلالؒ نے اپنے والد کو کہا کہ ہمارے زمانے میں عورتیں اگر مسجد میں جائیں گی تو فتنے میں مبتلا ہو جائیں گے لہٰذا ہم انہیں مسجد میں جانے سے روکیں گے۔ باوجودیکہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت بلالؒ کو ان کے اس جواب پر سرزنش کی ☆ لیکن خود حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی شرعی احکام پر عمل پیرا ہونے کے لیے اس اصول (یعنی سدالذرائع) کو مدنظر رکھتے تھے جس کی وجہ سے ان کے بیٹے نے اس حدیث پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے اپنے دورِ خلافت میں حجاج بن یوسف ثقفی کو حضرت عبداللہ بن زبیر i کی حجاز میں قائم شدہ خلافت کو ختم کرنے کے لیے بھیجا۔ اس وقت دو افراد حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آئے اور کہنے لگے:

إِنَّ النَّاسَ صَنَعُوْا وَأَنْتَ ابْنُ عُمَرَ وَصَاحِبُ النَّبِیِّ ﷺ فَمَا یَمْنَعُکَ أَنْ تَخْرُجَ؟ فَقَالَ یَمْنَعُنِیْ أَنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ دَمَ أَخِیْ فَقَالَا اَلَمْ یَقُلِ اللّٰهُ ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لاَ تَکُوْنَ فِتْنَةٌ﴾ فَقَالَ قَاتَلْنَا حَتّٰی لَمْ تَکُنْ فِتْنَةٌ وَکَانَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ وَأَنْتُمْ تُرِیْدُوْنَ أَنْ تُقَاتِلُوْا حَتّٰی تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِغَیْرِ اللّٰهِ؟ (۱۰۰)

''لوگوں نے امانت کو ضائع کر دیا (یعنی حق دار کو امارت وخلافت عطا نہ کی) اور آپؓ حضرت عمرؓ کے

☆ بعض روایات میں ہے کہ سیدنا ابن عمرؓ اپنے بیٹے پر سخت ناراض ہوئے تھے اور آخر عمر تک اس سے بات نہ کی۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ بیٹے کا اسلوب مناسب نہ تھا۔ حدیث سننے کے بعد اس طرح کا رویہ نہیں ہونا چاہیے کہ انسان اس کو سنتے ہی ردّ کر دے، بلکہ اس پر عمل نہ کرنے کا جواز حدیث کے ادب واحترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے علمی انداز سے پیش کرنا چاہیے۔

بیٹے ہیں' اللہ کے رسول ﷺ کے صحابیؓ بھی ہیں' پھر بھی آپ ان ظالم حکمرانوں کے خلاف خروج کیوں نہیں کرتے؟ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا مجھے اللہ کا یہ حکم ان کے خلاف خروج سے روکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان بھائی کے خون کو حرام کیا ہے۔ تو اس شخص نے کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نہیں دیا کہ ان سے قتال کرو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے؟ (یعنی حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو بنوامیہ کے فتنے سے نکالنے کے لیے قتال ہونا چاہیے) تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے جواب دیا: ہم نے قتال کیا تھا یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو گیا اور دین (یعنی اطاعت) اللہ ہی کے لیے ہو گیا اور تم یہ چاہتے ہو کہ تم قتال کرو یہاں تک کہ فتنہ پیدا ہو اور دین غیر اللہ کے لیے ہو جائے؟''

صحیح بخاری ہی کی ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے آ کر کہا کہ آپ ہر سال حج و عمرہ تو کرتے ہیں لیکن اللہ کے راستے میں جہاد نہیں کرتے۔ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا: ارکان اسلام پانچ ہی ہیں' یعنی جہاد ان میں شامل نہیں ہے۔ تو اس شخص نے کہا اللہ تعالیٰ نے تو یہ حکم دیا کہ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ اور اگر پھر ان میں کوئی ایک زیادتی کرے تو اس کے خلاف لڑو۔ یہ شخص دراصل حضرت عبداللہ بن عمر i کو کہہ رہا تھا کہ ﴿فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ﴾(الحُجُرٰت:۹) کی نص کے تحت آپ پر ظالم گروہ کے ساتھ قتال واجب ہے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اسے وہ جواب دیا جو اوپر مذکور ہے۔

(۱٦) بعض اوقات کوئی امتی آپ ﷺ کے حکم کے ظاہر کی بجائے آپؐ کے مقصود و منشا کو ملحوظ رکھتا ہے جس کی وجہ سے آپؐ کے ظاہری حکم پر عمل نہیں ہوتا۔ اس صورت میں آپؐ کے ظاہری حکم پر عمل نہ کرنا افضل ہوتا ہے اگرچہ ظاہری حکم پر عمل بھی درست ہوتا ہے۔ مثلاً غزوۂ احزاب کے بعد اللہ کے رسول ﷺ نے بنوقریظہ سے ان کی بدعہدی کا بدلہ لینے کے لیے صحابہؓ کو حکم دیا کہ وہ بنوقریظہ کی طرف کوچ کریں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے مسلمانوں میں یہ منادی کرائی کہ:

((لاَ یُصَلِّیَنَّ أَحَدٌ الظُّھْرَ إِلاَّ فِیْ بَنِیْ قُرَیْظَةَ)) فَتَخَوَّفَ نَاسٌ فَوْتَ الْوَقْتِ فَصَلُّوْا دُوْنَ بَنِیْ قُرَیْظَةَ' وَقَالَ آخَرُوْنَ لَا نُصَلِّیْ إِلاَّ حَیْثُ أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَإِنْ فَاتَنَا الْوَقْتُ' قَالَ : فَمَا عَنَّفَ وَاحِدًا مِنَ الْفَرِیْقَیْنِ(۱۰۱)

''تم میں کوئی بھی اُس وقت تک ظہر کی نماز ہرگز نہ پڑھے جب تک کہ وہ بنوقریظہ میں نہ پہنچ جائے''۔ تو بعض لوگوں کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ (بنوقریظہ تک پہنچتے پہنچتے) ہماری نماز کا وقت فوت ہو جائے گا تو انہوں نے بنوقریظہ پہنچنے سے پہلے ہی (راستے میں) نماز پڑھ لی' جبکہ صحابہؓ کے ایک دوسرے گروہ نے کہا کہ ہم اسی جگہ ظہر کی نماز پڑھیں گے جہاں اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے چاہے ہماری نماز کا وقت ہی کیوں نہ گزر جائے۔ جب اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے دونوں گروہوں کے عمل کا تذکرہ کیا گیا تو آپؐ نے کسی گروہ کے فعل کا انکار نہیں کیا''۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپؐ کے ظاہری حکم کی جن صحابہؓ نے یہ تأویل کی تھی کہ آپؐ کا اس حکم سے اصل مقصود یہ تھا کہ بنو قریظہ تک جلدی پہنچو یہاں تک کہ ظہر کی نماز وہاں جا کر پڑھو' وہ تأویل درست تھی اور آپؐ نے ان کے اس فعل کی اپنی تقریر کے ذریعے تصویب فرمائی۔ علاوہ ازیں راستے میں نماز پڑھنے والا گروہ اس لیے افضل ہے کہ اس نے قرآن کے حکم ﴿اِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا﴾ پر بھی عمل کیا۔

(۱۷) بعض اوقات کوئی عالم نبی اکرم ﷺ کے کسی حکم کی یہ تأویل کرتا ہے کہ وہ لازمی حکم نہیں ہے لہٰذا وہ اس حکم پر عمل نہیں کرتا۔ مثلاً حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت علیؓ بن ابی طالب نے مشرکین اور مسلمانوں کے درمیان ہونے والا معاہدہ لکھا اور اس میں 'مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه' کے الفاظ لکھے تو اس پر مشرکین نے اعتراض کیا کہ یہ الفاظ معاہدے میں نہ لکھے جائیں' کیونکہ اگر ہم آپؐ کو اللہ کا رسول مانتے تو آپؐ سے جنگ نہ کرتے۔ اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا:

((اُمْحُهُ)) فَقَالَ عَلِيٌّ مَا أَنَا بِالَّذِيْ أَمْحَاهُ' فَمَحَاهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِيَدِهٖ[۱۰۲]

''اِن الفاظ کو مٹا دو''۔ حضرت علیؓ نے کہا: میں ان الفاظ کو مٹانے والا نہیں ہوں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے مٹا دیے''۔

حضرت علی h نے اس مسئلے میں آپؐ کے حکم کی تعمیل کو آپؐ کی محبت اور اپنے ایمان کے منافی سمجھا لہٰذا انہوں نے اس پر عمل نہ کیا اور آپؐ کے حکم کی یہ تأویل کی کہ وہ کوئی لازمی حکم نہیں ہے۔ امام نوویؒ نے 'شرح مسلم' میں اس حدیث کی یہی تأویل بیان کی ہے۔ اس طرح کی اور بھی بیسیوں روایات ایسی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ و تابعینؒ نے آپؐ کے ہر حکم کی اتباع کو لازم نہیں سمجھا اور نہ ہی وہ آپؐ کے ہر قول کو شریعت سمجھتے تھے۔ لیکن یہ فرق کرنا کہ آپؐ کے کون سے اقوال کا تعلق تشریع سے ہے اور کون سے اقوال ہمارے لیے شریعت نہیں ہیں' یہ کسی عام آدمی کا کام نہیں ہے' بلکہ یہ ان علماء کا کام ہے جن کی زندگیاں حدیث پڑھنے اور پڑھانے میں گزرتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ائمہ سلف میں شارحین حدیث اور فقہاء و محدثین نے یہ کام بحسن و خوبی کیا ہے اور حدیث کی شرح میں جا بجا یہ واضح کیا ہے کہ آپؐ کا یہ حکم وجوب کے لیے ہے یا استحباب کے لیے' اباحت کے لیے ہے یا منسوخ ہے' عام ہے یا خاص' مستقل ہے یا عارضی' مطلق ہے یا مقید' وغیرہ۔

اس مضمون کی اگلی قسط میں ہم اِن شاء اللہ رسول اکرم ﷺ کے افعال اور اتباع کے حوالے سے بحث کریں گے۔

(جاری ہے)

حواشی

(۱) سنن النسائی، کتاب مناسك الحج، باب التقاط الحصی۔

(۲) اقتضاء الصراط المستقیم: جلد۱، ص ۳۲۷۔ (۳) المجموع: جلد۸، ص۱۷۱۔

(٤) صحیح النسائی: ۳۰۵۷۔

(٥) صحیح البخاری، کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم۔

(٦) لسان العرب:باب س۔ن۔ن۔ (۷) تاج العروس: باب س۔ن۔ن۔

(۸) النهایة فی غریب الحدیث: باب السین مع النون۔

(۹) المفردات:باب س۔ن۔ن۔

(۱۰) معجم مقاییس اللغة: باب س۔ن۔ن (۱۱) اصول الفقه الإسلامی: ص٤٥۰۔

(۱۲) اصول الفقه الاسلامی:ص ٤٥۰۔ (۱۳) الوجیز:ص۳۹۔

(۱٤) الوجیز:ص۳۹۔ (۱٥) اصول الفقه الاسلامی:۷۸۔

(۱٦) اصول الفقه الاسلامی:۷۹۔ (۱۷) الوجیز:ص۳۹۔

(۱۸) علوم الحدیث فی ضوء تطبیقات المحدثین النقاد:ص۱٥، ۱٦۔

(۱۹) الوجیز: ص۱٦۱، ۱٦۲۔

(۲۰) سنن ابی داوٗد، کتاب العلم، باب فی کتاب العلم۔

(۲۱) فتح الباری، جلد۱، س۲٥۰۔ (۲۲) صحیح ابی داوٗد:۳٦٤٦۔

(۲۳) الوجیز:ص۱٦٤، ۱٦٥۔ (۲٤) المعجم الطبرانی، جلد ٥، ص۱٤۰۔

(۲٥) مجمع الزوائد: جلد۹، ص۲۰۔ (۲٦) هدایة الرواة:جلد ٥ ص۲۸٦۔

(۲۷) الشمائل المحمدیة:۲۹٤۔

(۲۸) صحیح البخاری، کتاب العلم،باب الانصات للعلماء۔

(۲۹) شرح عقیدة طحاویة لابن ابی العز الحنفی متوفی ۹۷۲هـ، ص۳۰۳، ۳۰٤۔

(۳۰) سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللّٰہﷺ، باب ماجاء فی الذی یفسر القرآن برأیه۔

(۳۱) هدایة الرواة: جلد۱،ص ۱٥۸۔ (۳۲) فتاوی ابن الصلاح:۲٦۔

(۳۳) عمدة التفسیر: جلد۱، ص٤٥۔ (۳٤) ضعیف الترمذی:۲۹٥۲۔

(۳٥) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب من کفر أخاه بغیر تأویل فهو کما قال۔

(۳٦) سنن ابی داوٗد، کتاب الأدب، باب فی النهی عن البغی۔

(۳۷) صحیح ابی داوٗد:٤٤۰۱۔ (۳۸) عمدة التفسیر:جلد۱، ص٥۲۲۔

(۳۹) سنن أبی داوٗد، کتاب النکاح، باب ما یؤمر به من غض البصر۔

(٤۰) مجموع الفتاوی:جلد۲۲، ص۱۲۸ ۔ (٤۱) صحیح ابی داوٗد:۲۱٤۸۔

(٤٢) **اصول فقہ پر ایک نظر: ص٢٠۔**
(٤٣) صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، باب إذا دخل أحدکم المسجد فلیرکع رکعتین قبل أن یجلس۔
(٤٤) فتح الباری مع صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، باب إذا دخل أحدکم المسجد فلیرکع رکعتین قبل أن یجلس۔
(٤٥) صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب الخضاب۔
(٤٦) فتح الباری مع صحیح البخاری، کتاب اللباس، باب الخضاب۔
(٤٧) صحیح البخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب نھی النبی علی التحریم إلا ما تعرف اباحتہ۔
(٤٨) فتح الباری مع صحیح البخاری۔
(٤٩) صحیح البخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔
(٥٠) فتح الباری مع صحیح البخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔
(٥١) الوجیز: ص٤٨۔
(٥٢) صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، باب استحباب لبس النعل فی الیمنی اولاً والخلع من الیسریٰ۔
(٥٣) شرح النووی مع صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، باب استحباب لبس النعل فی الیمنی اولاً۔
(٥٤) صحیح البخاری، کتاب التمنی، باب کراھیۃ التمنی لقاء العدو۔
(٥٥) الوجیز: ص٥٤۔
(٥٦) صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب تحریم الخطبۃ علی خطبۃ اخیہ حتی یاذن او یترک۔
(٥٧) شرح النووی مع صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب تحریم الخطبۃ علی خطبۃ اخیہ حتی یاذن او یترک۔
(٥٨) **اصول فقہ پر ایک نظر، ص٢٩۔**
(٥٩) صحیح مسلم، کتاب الحیض، باب الوضوء مما مست النار۔
(٦٠) سنن الترمذی، کتاب الطھارۃ عن رسول اللہﷺ، باب ما جاء فی الوضوء مما غیرت النار۔
(٦١) صحیح الترمذی: ٧٩۔
(٦٢) شرح سنن الترمذی، ج١، ص ١٤٤۔
(٦٣) سنن النسائی، کتاب الطھارۃ، باب ترک الوضوء مما غیرت النار۔
(٦٤) المجموع، ج٢، ص ٥٦۔
(٦٥) موافقۃ الخبر الخبر: جلد٢، ص٢٧٣۔
(٦٦) البدر المنیر: جلد٢، ص٤١٢۔
(٦٧) شرح معانی الآثار: جلد١، ص٦٧۔
(٦٨) المحلی: جلد١، ص٢٤٣۔
(٦٩) المغنی: جلد١، ص٢٥۔
(٧٠) صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قالہ شرعا دون ما ذکرہ من معایش۔
(٧١) سنن ابی داوٗد، کتاب الطلاق، باب فی المملوکۃ تعتق وھی تحت حر او عبد۔
(٧٢) المحلی: جلد٩، ص٢٣٤۔
(٧٣) مجموع الفتاویٰ: جلد١، ص٣١٧۔
(٧٤) صحیح ابی داوٗد: ٢٢٣١۔
(٧٥) مسند احمد، جلد٣، ص٢٥٤۔

(٧٦) صحيح البخارى، كتاب الشهادات، باب من اقام البينة بعد اليمين۔وصحيح مسلم، كتاب الاقضية، باب الحكم بالظاهر واللحن بالحجة۔

(٧٧) صحيح البخارى، كتاب الاضاحى، باب قول النبىﷺ لابى بردة ضح بالجذع من المعز۔ وصحيح مسلم، كتاب الاضاحى، باب وقتها۔

(٧٨) صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب رضاعة الكبير۔

(٧٩) سنن ابى داؤد، كتاب النكاح، باب فيمن حرم به ۔

(٨٠) صحيح ابى داؤد: ٢٠٦١۔

(٨١) صحيح مسلم، كتاب اللباس والزينة، باب النهى عن الجلوس فى الطرقات واعطاء الطريق حقه۔

(٨٢) صحيح مسلم، كتاب الاضاحى، باب بيان ما كان من النهى عن اكل لحوم الاضاحى۔

(٨٣) صحيح مسلم، كتاب الاضاحى، باب بيان ما كان من النهى عن اكل لحوم الاضاحى۔

(٨٤) سنن الترمذى، كتاب الطلاق واللعان عن رسول اللهﷺ ، باب ماجاء فى الرجل يساله ابوه ان يطلق زوجته۔

(٨٥) سنن الترمذى: ١١٨٩۔

(٨٦) عارضة الاحوذى، ج٣، ص ١٣٥۔

(٨٧) صحيح الترمذى: ١١٨٩۔

(٨٨) مسند احمد، ج٧، ص ١٣٢۔

(٨٩) مسند احمد: ٤٤٨١۔

(٩٠) مصنف ابن ابى شيبة، ج٤، ص ١٧٣۔

(٩١) صحيح ابن حبان، جلد٢، ص١٦٧۔

(٩٢) صحيح الترغيب:٢٤٨٦۔

(٩٣) فتاوى الأزهر، جلد ٩، ص٤٣٩۔

(٩٤) فتاوى الجنة الدائمة، جلد ٢٠، ص٣٢۔

(٩٥) صحيح البخارى، كتاب اللباس، باب تقليم الأظافر۔

(٩٦) صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب خروج النساء الى المساجد اذا لم يترتب عليه الفتنة۔

(٩٧) صحيح البخارى، كتاب الجمعة، باب هل على من لم يشهد الجمعة غسل من النساء والصبيان۔

(٩٨) صحيح البخارى، كتاب الاذان، باب خروج النساء الى المساجد بالليل والغلس۔

(٩٩) صحيح مسلم، كتاب الصلاة، باب خروج النساء الى المساجد اذا لم يترتب على الفتنة۔

(١٠٠) صحيح البخارى، كتاب تفسير القرآن، باب قوله وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين للّٰه۔

(١٠١) صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب المبادرة بالغزو وتقديم اهم الامرين المتعارضين۔

(١٠٢) صحيح البخارى، كتاب الصلح، باب كيف يكتب هذا ما صالح فلان بن فلان وفلان بن فلان۔

جماعت سازی اور اس کی بنیادیں (۳)

قاری یحییٰ اشرف عبدالغفار☆

بیعت کے بارے میں معاصر علماء کے اقوال

(۱) ابوعبدالرحمٰن عقیل بن محمد بن زید المقطری المصری اقسامِ بیعت کے تحت لکھتے ہیں:

''بیعت کی دو قسمیں ہیں:

(۱) **عام بیعت**: بیعت کی یہ قسم عام بیعت میں سے ہے' اسے توڑنے یا ترک کرنے پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ بیعت (عہد) اگر کسی جائز (مشروع) کام کے لیے ہو تو جائز ہے' بلکہ بعض اوقات واجب ہے۔ اور اگر یہ بیعت کسی ناجائز (منکر) کام کے لیے ہو تو ناجائز ہے اور اس کے ناجائز ہونے پر یہ آیت مبارکہ دلیل ہے' ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ﴾ (المائدۃ:۲)

''نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو' اور گناہ اور سرکشی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔''

سورۃ المائدۃ کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ (المائدۃ:۱)

''اے ایمان والو! عہدوں کی پاسداری کرو۔''

(۲) **بیعت خاص**: یہ وہ بیعت ہے جو امام المسلمین (خلیفہ اسلام) کے لیے ہے اور یہ بیعت واجب ہے' اس کو ترک کرنا گناہ ہے' جبکہ بیعت کرنے والا بیعت کرنے پر قادر ہو''۔ (٦٤)

(۲) ڈاکٹر یوسف القرضاوی ''**العمل الاسلامی الجماعی. رأی واجتهاد**'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''اسلام کے لیے اجتماعی شکل میں کام کرنا ایک ضرورت بھی ہے اور فریضہ بھی' بشری ضرورت بھی ہے اور شرعی ضرورت بھی۔ پس اجتماعی عمل ایک بشری ضرورت ہے' کیونکہ انسان بذاتِ خود قلیل

☆ ریسرچ ایسوسی ایٹ' شعبہ تحقیق اسلامی' قرآن اکیڈمی لاہور

(یکہ وتنہا) ہے' اور اپنے بھائیوں (باقی انسانوں) کی وجہ سے کثیر (زیادہ) ہے۔ اور شرعی فرض اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے ہمیں اجتماعیت اور اتحاد کے بارے میں تاکید کی ہے۔ ایک جماعت کا تصور بغیر تنظیم وتنسیق' قیادت اور کارکنان کے اور پلان اور ہدف کے' بغیر مقصد کے تحقق کے' ممکن نہیں ہے''۔

شیخ قرضاوی مزید لکھتے ہیں:

''دین ہمیں نیکی اور تقویٰ میں اتحاد اور تعاون کا حکم دیتا ہے۔ یہ نیکی اور تقویٰ اہم اور خاص اعمال میں سے ہیں۔ نتیجہ خیز اسلامی کام کے لیے تنظیم ضروری ہے' صرف اجتماع کافی نہیں ہے' جب تک وہ منظم نہ ہو۔ درحقیقت اجتماع ہی نہیں جب تک تنظیم نہ ہو' اور تنظیم کے لیے ذمہ دار قیادت اور فرماں بردار کارکن (سپاہی) موجود ہوں۔ اسلام ہر کام کے بارے میں تنظیم پر زور دیتا ہے' حتیٰ کہ بعض اوقات عادی امور میں بھی' جیسا کہ سفر کے سلسلہ میں بھی امیر بنانے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اور ایک شرعی قیادت اُس وقت تک فائدہ مند نہیں جب تک وہ ایک آزاد رائے اور صحیح بیعت کی صورت میں سامنے نہ آئے اور بعض خلافِ واقعہ حالتوں میں اجتماعی قیادت کے وجود میں کوئی ممانعت نہیں ہے' بلکہ ضروری ہوگا کہ تمام اسلامی ملکوں میں اسلامی جماعت قائم ہو جائے' جو دعوت کی ذمہ داری اٹھائے۔ اور اسلامی معاشرے کو بیدار کرنے کے لیے' اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے اور قرآن کی حاکمیت اور اسلامی ریاست کے قیام کے لیے راستہ ہموار کر سکے۔'' (٦٥)

(**۳**) استاذ ڈاکٹر جمال الدین عطیہ اس سوال کے جواب میں کہ آیا بیعت سربراہِ جماعت کے لیے دینا بھی جائز ہے یا یہ کہ بیعت صرف خلیفہ (یعنی اسلامی ریاست کے سربراہ) تک محدود ہے؟ رقمطراز ہیں:

''بیعت ایک عقد ہے جو سربراہِ جماعت (یعنی امیر جماعت) کے لیے اسی طرح جائز ہے جس طرح خلیفہ کے لیے جائز ہے۔ البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ خلیفہ کی بیعت کا موضوع ہے ریاست اور حکومت سے متعلق عام امور پر اتفاق کرنا' جبکہ سربراہِ جماعت (امیر جماعت) کے ساتھ بیعت نظامِ جماعت کی حفاظت اور جماعت کے اہداف کو یقینی بنانے پر ہے۔ اور یہ بیعت سربراہِ ریاست کی بیعت کے قائم مقام نہیں ہے.....''(٦٦)

(**٤**) ڈاکٹر فتحی یکن اور استاذ فتحی عبدالستار کے فتویٰ سے ایک اقتباس:

''حقیقت میں بیعت جو کسی جماعت/انجمن/یا جماعات میں سے کسی کو دی جاتی ہے وہ بیعت درحقیقت از قبیل عقد ہوتی ہے اور اس بیعت سے مراد ومقصود نیک عمل پر التزام ہوتا ہے' جس پر جانبین کی طرف سے اتفاق ہو گیا ہو.....ایسی صورت میں ہمیں حکم ہے کہ عقود ومعاہدات اور مواثیق کو پورا کریں' مگر اس بیعت کو توڑنے کی صورت میں اس پر کچھ بھی مؤاخذہ نہیں ہوتا' جیسا کہ خروج عن الملة (ملت سے نکلنا)۔ البتہ لزومِ جماعت کے حوالے سے موجود احادیث کا

اطلاق جماعات پر نہیں ہے' بلکہ ان سب احادیث سے یہاں پر مراد ایک جامع معنی میں جماعت مراد ہے (یعنی ساری کی ساری اُمت) اور جماعتی بیعت توڑنے کی صورت میں فقہاء اس بیعت کا قیاس قسم پر کرتے ہیں اور قسم توڑنے کا کفارہ بیعت توڑنے کا کفارہ تصور ہوگا۔ یہ بیعت توڑنا خواہ کسی بھی وجہ سے ہو جائز نہیں' کیونکہ حقیقت میں یہ طبعی طور پر عہد سے وفا ہے اور عہد کو توڑنا نفاق (منافقت) کا ایک شعبہ ہے''۔(٦٧)

(**٥**) الشیخ سلیمان العودہ سے جب یہ سوال کیا گیا کہ اسلامی جماعت جس کے ارکان (رفقاء) جماعت کے امیر کے ساتھ سمع وطاعت کی بیعت کرتے ہیں' اُن کے لیے ایسے حال میں کیا حکم ہے جب کچھ اوامر خلافِ شرع نہ ہوں اور شریعت سے متعارض نہ ہوں' تو انہوں نے جواب دیا کہ:

''میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کا شخصی التزام منت (نذر) کے مشابہ ہے' جس میں مکلّف خود اپنے اوپر لازم قرار دے دیتا ہے جو شریعت نے اصلاً اس پر واجب نہیں کیا اور میں ذاتی طور پر اس کو مکروہ سمجھتا ہوں۔ مگر ضرورت اور ظاہری مصلحت کی صورت میں مکروہ نہیں ہے''۔(٦٨)

(**٦**) مولانا ثناء اللہ امرتسری m کی رائے ہے کہ امامت کبریٰ اور اطاعت وفرماں برداری والی حدیثوں کو تنظیمی امور کی امارتوں پر قیاس کرنا درست نہیں ہے' چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''امارت سیاسیہ اس ملک میں ناپید ہے اور شاید عرصہ تک ناپید ہی رہے' اِلَّا اَنْ یَشَاءَ اللّٰہُ. اس کے لیے مزید بحث نہیں۔ دوسری امارتیں' وہ ممکن ہے' مثلاً امیر عائلہ یعنی خاندانی امیر یا امیر سفر یا امیر خاص قوم یا خاص گروہ' ان امارتوں کا وہ حکم نہیں ہے جو امیر سیاست کا ہے۔ آج کل جو کہیں کہیں سے امیر بننے کی خبریں آتی ہیں یا بن جاتے ہیں ان کی حدود صرف اتنی ہیں کہ جو اُن کے حلقہ بیعت میں آجائے اس کو حکم یا مشورہ دیں' اس سے تجاوز نہ کریں۔ یعنی یہ حکم نہ لگائیں کہ جو ہم میں داخل نہیں ہے وہ موتِ جاہلیت مرے گا۔ اگر ایسا کریں تو میں اُن امارتوں کو چنداں معیوب نہیں سمجھتا مگر جب وہ اپنی حد سے تجاوز کر جائیں' یعنی یہ حکم لگائیں کہ جو اُن کے حلقہ میں داخل نہ ہوئے ہوں ان کی خیرات وصدقات قبول نہیں' ان کا جمعہ جماعت صحیح نہیں ہے' ایسی حالت میں ان امیروں سے کہا جائے گا: ﴿لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ غَیْرَ الْحَقِّ﴾ (المائدۃ: ٧٧) میں اس امر کو جائز سمجھتا ہوں کہ ایسی امارتیں ہر شہر اور ہر بستی میں قائم ہو جائیں جس میں باہمی نفاق وشقاق نہ ہو' بے شک وہ اپنے حلقۂ اثر سے صدقات اور زکوٰۃ جمع کر کے غرباء پر تقسیم کریں نہ اپنے نفس پر' نہ اپنے لیے جمع کریں۔ بس یہ ہے ایک طریق امارت جو معمول ہو سکتا ہے اور بحکم ارشاد الٰہی: ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا﴾ (البقرۃ: ٢٨٦) جائز اور مشروع ہے''۔(٦٩)

(**٧**) مذکورہ تحریر کی تائید میں ایک سلفی عالم شیخ ممتاز احمد عبداللطیف اس طرح رقم طراز ہیں:

''یہی حق ہے' کیونکہ خلیفۃ المسلمین اپنی رعیت کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کا ذمہ دار

ہوتا ہے' جبکہ تنظیمی امور کے امیروں کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے' بلکہ یہ ایک عارضی حل ہے جس کو ملکی حالات وظروف کے پیش نظر مختلف شکلوں میں ڈھالا جاتا ہے اور اس کے حل کے بعد خود بخود اس کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ تنظیمی اعتبار سے جو اصول وضوابط اور لائحہ عمل کسی نظام کو چلانے کے لیے وضع کیے جائیں اور وہ کتاب وسنت سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں تو ان کی پابندی ضروری ہے..... تنظیمی امارت تو ایک وقتی ضرورت ہوتی ہے' اسے وقت کے ڈھانچے میں ڈھال کر کام کرنا چاہیے' خواہ اس نظام کا نام امارت رکھا جائے یا صدارت یا جمعیت یا جماعت۔ واللہ اعلم بالصواب۔''(۷۰)

(۸) ڈاکٹر مصطفیٰ الطحان لکھتے ہیں:

''وہ بیعت جو ایک فرد اسلامی تنظیم میں ایک امیر کو دیتا ہے وہ عقد ہے جو اُن کے حق میں وکالت کرے گا۔ تنظیمی امور کی تصریف (استعمال) میں شرعی اور قانونی ضابطوں کے ضمن میں' جو تنظیم کے لائحۂ عمل میں شامل ہو' اگر امیر نے اس عقد پر وفا کیا تو ان کو افراد (کارکن) پر معروف میں سمع و طاعت کا حق ہوگا۔ اور بیعت کی پاسداری واجب ہے جبکہ بے وفائی وغداری حرام ہے۔ اگرچہ اسے توڑنا جائز ہے' وہ اس طرح کہ بیعت کرنے والا امیر سے مطالبہ کرے کہ مجھے اپنی بیعت سے فارغ کر دیں تاکہ میں جماعت (قائد) کی شرائط اور لوازمات سے الگ ہو جاؤں''۔(۷۱)

(۹) ڈاکٹر محمد عبداللطیف البنا لکھتے ہیں:

''بیعت تعاہد کے معنیٰ میں ہے اور اسلام معروف کاموں میں سے کسی کام پر بیعت لینے سے منع نہیں کرتا جب تک یہ بیعتِ اسلام' جو حکمران لیتے ہیں' کا مفہوم نہ لے اور بیعت لینے والا اپنے آپ کو خلیفۃ المسلمین نہ سمجھے۔ یہ نیک کام میں ہو' شر میں نہ ہو' تعمیر میں ہو تخریب میں نہ ہو۔ اس پر مندرجہ ذیل امور دلالت کرتے ہیں:

(۱) امیر کا بنانا اور اس کے لیے بیعت لینا ایک فطری حکم ہے: بعض ایسی امارتیں ہیں جو خاص حالات میں خاص ضرورتوں کے لیے بنی ہیں' جیسے امیر حج' امیر سفر اور امیر قتال۔ مثلاً خالد بن ولید h کی امارت موتہ میں۔ ایسی امارات اور بیعات طبعی اور فطری صورت میں بن جاتی ہیں اور یہ فطری امر ہر معاشرے میں ایک حقیقت ہے۔ اصل میں ایسی امارتوں اور بیعات میں جو معاملے تشکیل پاتے ہیں وہ ایک طبعی صورت میں پاتے ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ امامت کبریٰ کے قائم مقام ہے' بلکہ یہ ایک فطری امر ہے جو معاشرے میں ایک حقیقت ہے۔

(۲) ضرورتوں کی کثرت: اسلامی شریعت میں کچھ کام ایک طاقت ور اجتماعیت کے محتاج ہوتے ہیں' جیسے نیکی کی طرف بلانا' برائی سے منع کرنا' اللہ کے راستے میں جہاد کرنا' بدعت اور منکرات کا ازالہ کرنا اور اسلامی حکومت کا قیام۔ کیونکہ یہ کام فردِ واحد نہیں کر سکتا کہ وہ اٹھے اور کرے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب ان کی طاقت اور اثر ورسوخ معاشرہ میں زیادہ ہو' اس کام کو انجام دینے کے لیے

کم از کم ایسی اجتماعیت ضروری ہے جو اِس کام کے معنی کو سمجھتی ہو۔

(۳) قیادت کی ضرورت اور اس کے لیے بیعت: جب یہ عارضی اجتماع منعقد کیا جاتا ہے تو ضروری ہے کہ اس کا ایک امیر ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِذَا خَرَجَ ثَلَاثَۃٌ فِیْ سَفَرٍ فَلْیُؤَمِّرُوْا اَحَدَھُمْ)) (۷۲)

''جب تین بندے سفر پر نکلیں تو اپنے میں سے ایک کو امیر مقرر کر لیں''۔

اور جب امارت ہو تو امیر کے لیے ایک معلوم معاملے میں، جس پر جانبین کا اتفاق ہو، عہد اور بیعت لینا جائز ہے بشرطیکہ بیعت اسلامی شریعت کے خلاف نہ ہو (یعنی گناہ میں نہ ہو)۔

(۴) امام کے ساتھ منازعت نہ ہو: اس بیعت میں اس امیر کے لیے کوئی جھگڑا نہیں امامت کبریٰ کے لیے، کیونکہ اصل میں امام موجود نہیں ہے اور اگر موجود ہے تب بھی کوئی منازعہ (جھگڑا) نہیں ہے، بلکہ یہ ایک بیعت ہے۔ اسلام میں نیک اعمال میں سے کسی عمل کو، مردہ سنتوں میں سے کسی سنت کو زندہ کرنا ایک تعاہد کی شکل میں اور منظّم صورت میں ہی انجام پاتا ہے اور یہ شرعی دلائل سے متصادم نہیں ہے، بلکہ ایسے بہت سارے دلائل ہمیں تعاون اور نیک عمل کی ترغیب دیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (المائدۃ: ۲) ''اور ایک دوسرے سے تعاون کرو نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں، اور ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو گناہ اور زیادتی کے کاموں میں۔''

(۵) یہ بیعت جنس نذر (منت) میں سے ہے: نیک اعمال میں سے کسی عمل پر کاربند رہنا دراصل اطاعت پر التزام ہے، یہ از قبیل نذر ہے اور نذر کی مشروعیت مطلقاً جائز ہے، اس میں کوئی اختلاف و نزاع نہیں ہے۔

خلاصہ: میرے (محمد عبداللطیف البنا کے) خیال میں جماعات کی بیعت میں جو رکاوٹ ہے وہ تعصب ہے، یعنی یہ سمجھنا کہ ''ہم ہی جماعت المسلمین ہیں، باقی نہیں'' یا کسی شر پر عہد لینا۔ بہرحال امیر جماعت کے لیے بیعت جائز ہے اور ان حدود سے تجاوز جائز نہیں ہے جس پر جانبین کی طرف سے اتفاق کیا گیا ہو''۔ (۷۳)

(۱۰) الشیخ عبدالعزیز عبدالقادر القاری ایک سوال کے جواب میں تحریر کرتے ہیں:

''اصل میں بیعت جماعت عظمیٰ (امامت کبریٰ) کے لیے ہے اور تعاقد اور تعاہد عرف غالب کی نظر میں جماعتِ صغریٰ کے لیے درست ہے، جیسا کہ عام لوگ کسی عالم کو اپنا امام اور قائد بنا لیں اور درمیان میں طے ہو کہ بیعت کی جائے، تو یہ بھی درست ہے۔ کیونکہ عہد مکی میں انصار نے جب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عقبہ کے مقام پر بیعت کی تو یہ پہلی بیعت پوشیدہ تھی جبکہ ابھی اسلامی حکومت نہیں بنی تھی اور انصار (اہل مدینہ) نے جب بیعت کی تو یہ بیعت بحیثیت ایک نبی کے تھی کہ وہ اللہ کے نبی ہیں، نہ کہ اسلامی دولت کے امیر کی۔ یا اگر ہم کبھی (کسی شخص کی بیعت کر لیں) ایک عام

بندے کی حیثیت سے جو اللہ کی طرف بلاتے ہیں نہ کسی اور کی طرف''۔ (۷٤)

(۱۱) شیخ ولید بن علی الحسین عضو هیئة التدریس، قسیم یونیورسٹی سعودی عربیہ، ایک فتویٰ میں لکھتے ہیں:

''حقیقت میں جو بیعت آپ کسی تحریک یا جماعت سے کرتے ہیں وہ بیعت عقد کا طریقہ ہے، جس میں مراد اور مقصود عمل صالح پر التزام اور دوام ہے جس پر جانبین کی طرف سے ادارتی (تنظیمی) طور پر اتفاق ہو گیا ہو۔ یہ عقد ہے اور اللہ تعالیٰ نے عقدوں، عہدوں اور میثاقوں کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے ﴿اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ (المائدۃ: ۱) اس طرح بیعت پر اور عقد توڑنے پر کسی طرح آثار مرتب نہیں، جو آثار بیعت کبریٰ کی صورت میں مرتب ہوتے ہیں۔ جیسے خروج عن الملة (ملت سے نکلنا)''.....''اگر بیعت توڑنے (چھوڑنے) کا ارادہ ہو جس کے ساتھ عقد ہے اس سے اجازت لے ورنہ کفارۃ النذر واجب ہوگا۔ اور معلوم ہونا چاہیے کہ اصل میں ایسے عقود میں وفاء ہے جب تک شرعی حکم کے ساتھ تصادم نہ ہو (واللہ اعلم)''(۷۵)

(۱۲) شیخ رائد صلاح حدیث سفر میں امام ابن تیمیہ m کی تشریح نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''یہ عہد امارتِ صغریٰ کے عقد میں درج ہے، اقامت دین کے لیے خیر اور معروف میں یہ ایک ضروری مرحلہ ہے۔ اسلام کے جھنڈے کو بلند تر کرنے کی خاطر اس عہد کو پورا کرنا ہر اس فرد کے لیے ضروری ہے جو اس جماعت کی قیادت سے بیعت کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴾ (الاسراء: ۳٤) ایک اور جگہ ارشاد ہے: ﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ (المائدۃ: ۱) (۷٦)

(۱۳) استاد مصطفیٰ مشہور m نے بیعت کے بارے میں لکھا ہے:

''عظیم اسلامی اہداف کو حاصل کرنا ہر مسلمان و مسلمہ سے مطلوب ہے، لیکن ان اہداف کا حصول انفرادی طور پر ممکن نہیں ہے اور ان کوششوں کو بغیر جماعت کے انفرادی طور پر منظم کرنا ممکن نہیں۔ ان کے لیے لائحۂ عمل ترتیب دینا اور وسائل اور امکانیات فراہم کرنا بھی ممکن نہیں۔ ''ما لا یتم الواجب الا به فهو واجب'' (یعنی جس امر پر واجب کی ادائیگی موقوف ہو وہ بھی واجب ہے) کے مصداق ہم بغیر قیادت کے جماعت کا تصور نہیں کر سکتے اور قیادت کو قیادت نہیں کہہ سکتے، جب تک قیادت کو اپنے افراد پر سمع و طاعت کا حق نہ ہو۔ اور جماعت میں افراد کا ڈسپلن (تنظیم) بغیر اطاعت و فرماں برداری کے ممکن نہیں۔ بلکہ یہ تصور بھی محال ہے کہ جماعت کے افراد وفا کریں اور فرائض کی ادائیگی کا التزام کریں۔ یعنی بغیر امیر کے جماعت نہیں ہے اور وہ امیر نہیں ہے جس کو اپنے کارکن سمع و طاعت میں نہ مانیں۔ کارکن اُس وقت تک فرماں بردار نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے امیر کے ساتھ بیعت (عہد) نہ کریں۔''(۷۷)

(۱۴) بانی تحریک اسلامی واخوان المسلمون استاد حسن البنا m نے بیعت کو **عهد العمل للاسلام** سے تعبیر کیا ہے اور اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ بیعت ہے اخلاص پر' خالص اللہ کے لیے' اور عمل پر اللہ کے دین کے لیے' وہ عمل جس کی شروعات معلوم اور آخر واضح ہو''۔ شیخ حسن البنا m نے بیعت کے لیے دس ارکان (**الفهم' الاخلاص ' العمل' الجهاد' التضمية' الطاعة' الثبات' التجرد' الاخوة ' التقية**) ورتقریباً ۳۳ شرائط متعین کی ہیں۔ ان شرائط میں سے ایک شخصی عہدوں پر وفا کرنا بھی ہے اور اسی طرح دعوتی واجبات پر وفا کرنا وغیرہ۔[۷۸]

الاخوان المسلمون کے نزدیک بیعت کے الفاظ یہ ہیں:

اعاهد الله العلى العظيم على التمسک بدعوة الاخوان المسلمين والجهاد فى سبيلها والقيام بشرائط عضويتها والثقة التامة بقيادتها والسمع والطاعة فى المنشط والمكره واقسم بالله العظيم على ذلک وابايع عليه والله على ما اقول وكيل ولا حول ولا قوة الا بالله[۷۹]

(۱۵) الشیخ عبداللہ ناصح علوان' سابق استاد' اسلامک سٹڈیز' کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ بیعت کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

''یہ امر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اگر اسلامی جماعت ہو' جو اِن ذمہ داریوں کو پوری کرنے والی اور اہداف کو حاصل کرنے والی ہو' تو ضروری ہے کہ اس کا امیر ہو اور امیر کے لیے ضروری ہے کہ وہ بیعت لے۔ اور بیعت اُس امیر کی ہوگی جو اطاعت اور التزام کی بنیاد پر بیعت لے گا۔ اور اطاعت کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے لیے کام کیا جائے اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا جائے۔ اور جہاد اللہ کے دین اور زمین پر اللہ کے نظام اور حکم کو نافذ کرنے کے لیے تب ہوگا جب یہ ایک جماعت مضبوط بنیاد پر استوار ہو جو مؤمنوں کو ایک بڑے ہدف تک پہنچا سکتی ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے' جیسا کہ مسلم شریف نے روایت کیا ہے: ((مَنْ مَاتَ وَلَمْ تَكُنْ فِيْ عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً)) اور اسی وجہ سے آپ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ جب تین بندے سفر میں ہوں تو واجب ہے کہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں۔ اور جب تین سے زیادہ یا اس سے بھی زیادہ ہوں اور ان کے پاس قدرت ہو' صلاحیت ہو' ایک مکمل نقشہ پیش کرنے میں' اور ماننے والا حلقہ ہو اور اہداف واضح ہوں مسلمانوں کی حالت بدلنے کے لیے جو ان کے لیے بہتر ہو' ایسی صورت میں قیادت کی ایجاد اور امیر کا تقرر ان پر من باب اولیٰ واجب ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے ہر ایک پر واجب کیا ہے کہ جو امیر کے ساتھ بیعت کا عقد کرتے ہیں اور ان کی طاعت کا عہد کرتے ہیں' وہ مرتے دم تک اپنے عہد پر وفا کریں۔ عہد کو توڑنا مناسب نہیں ہے اور نہ خروج کرنا مناسب ہے جب

تک کہ کفر بواح کا حکم نہ دیں۔ حقیقت میں جو کچھ ہم نے پیش کیا' احادیث امارت اور بیعت اور طاعت وغیرہ کے حوالے سے' سب کچھ امامت کبریٰ پر دلالت کرتا ہے۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ:

حقیقت میں امامت کبریٰ فی الحال مسلمانوں کے درمیان موجود نہیں ہے اور مخلص اسلامی جماعت اگر امامت کبریٰ کے وجود کے لیے کام کرتی ہے تو وہ زیادہ مستحق ہے کہ مسلمان اس جماعت کو لازم پکڑیں' اس کی بیعت کریں اور اس کے امیر کی طاعت کریں۔ اسلامی جماعت کا موجودہ وسائل اور اہداف سے مالا مال ہونا' بلادِ اسلامیہ میں ایک شرعی فرض اور ایک حتمی ضرورت ہے''۔(۸۰)

(**۱۶**) مولانا گوہر رحمٰن دیوبندی mایک سوال کے جواب میں تحریر کرتے ہیں:

''ایمان و اسلام اللہ و رسول کی اطاعت و وفاداری کی بیعت ہی کا نام ہے اور رسول اللہ ﷺ بھی اپنے صحابہ سے بیعت اطاعت اور بیعت جہاد لیا کرتے تھے جو تجدید بیعت ہوتی تھی ورنہ اصل بیعت اور عہد تو وہ ایمان لاتے وقت کر لیتے تھے۔ آج بھی اگر لوگ کسی متبع سنت عالم ربانی کے سامنے اپنے ربّ کی اطاعت کی وفاداری کی بیعت کی تجدید کر لیں تو مفید ہے اور اصلاحِ نفس کی ایک تدبیر ہے''۔(۸۱)

(**۱۷**) تاریخ نجد میں امام حسین بن غنام ذکر کرتے ہیں کہ: سن ۱۱۵۳ھ میں محمد بن عبدالوہاب نے اپنی دعوت کا اعلان کر کے مظاہر شرک و بدعت کا سختی سے انکار کیا اور امر بالمعروف والنھی عن المنکر ہر خاص و عام کی خیر خواہی اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے لیے انتھک جدوجہد کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہ کرتے ہوئے علماء کرام کو خبردار کرتے ہوئے ان کی توجہ سورۃ البقرۃ کی مندرجہ ذیل آیت کریمہ کی طرف مبذول کرائی:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ وَالۡہُدٰی مِنۡۢ بَعۡدِ مَا بَیَّنّٰہُ لِلنَّاسِ فِی الۡکِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِکَ یَلۡعَنُہُمُ اللّٰہُ وَیَلۡعَنُہُمُ اللّٰعِنُوۡنَ ۙ﴾

''بے شک وہ لوگ جو چھپاتے ہیں جو اتاریں ہم نے روشن دلیلیں اور ہدایت کی باتیں بعد اس کے کہ ہم نے کھول کر بیان کر دیا انہیں لوگوں کے لیے کتاب میں' یہی وہ لوگ ہیں کہ لعنت کرتا ہے ان پر اللہ اور لعنت کرتے ہیں ان پر لعنت کرنے والے۔''

چنانچہ ان کی شہرت ہر جگہ پھیل گئی' خاص طور پر حریملا' عیینہ' الدرعیہ' الریاض اور منفوحہ میں۔ ان کی دعوت کے نتیجہ میں عوام دو گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ کی طرف سے تو ان کو بڑے پیمانے پر پذیرائی ملی' انہوں نے نہ صرف ان کے طریق کار کی پیروی کی بلکہ مختلف کتب' حدیث' فقہ' تفسیر کا درس حاصل کرتے ہوئے ان کی بیعت کی' ان کے ساتھ عہد کیا اور ان کی دعوت میں ان کے معاون بن گئے' جبکہ عوام کی غالب اکثریت ان کی مخالفت پر کمر بستہ ہوگئی۔(۸۲)

(۱۸) دارالافتاء دارالعلوم دیوبند' انڈیا سے اسلامی تحریکوں اور جماعات کے امراء کی بیعت کے بارے میں یہ سوال کیا گیا:

''کیا اسلامی تحریکوں اور جماعات کے امراء کو بیعت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اور وہ بھی ایسی صورت میں جب عمومی خیالات اور افکار عقائد اہل سنت والجماعت کے مطابق ہوں اور بغیر تعصب اور بغیر اس دعوت کے کہ صرف ہم ہی الجماعت ہیں باقی نہیں ہیں صرف اور صرف لاعلاء کلمۃ اللہ اور نظم جماعت کی خاطر آیا یہ عمل درست ہے یا نہیں؟ جواب مطلوب ہے''۔

دارالافتاء دارالعلوم دیوبند کی جانب سے اس سوال کا یہ جواب دیا گیا:

''یہ تو محض ایک رسمی بیعت ہوتی ہے جس میں بادشاہ کے ہاتھ میں لوگ بیعت لیتے ہیں اور بادشاہ ہر ایک سے عہد و پیمان کرتے ہیں کہ وہ تمام ذمہ داریوں کو بخوبی سنبھالے گا' اور عوام بھی یہ عہد کرتے ہیں کہ وہ بغاوت نہیں کریں گے۔ گویا کہ یہ ایک باہمی عہد و پیمان ہے' لیکن اس بیعت کا مقصد قطعاً یہ نہیں ہوتا ہے کہ وہ شرعی امور میں بھی امیر ہوتے ہیں' مذکورہ بیان کردہ نوعیت کے ساتھ امراء کو بیعت دی جاسکتی ہے''۔(۸۳)

حاصل کلام

(۱) لفظ بیعت کا اطلاق عقد' عہد' نذر' میثاق' قسم' شرط وغیرہ ہم معنی الفاظ پر کیا جاتا ہے۔ کچھ صورتوں میں یہ بیعت جائز ہے' جن کا اوپر ذکر کر دیا گیا ہے' اور بعض اوقات یہ واجب بن جاتی ہے۔ اور یہ مسنون بھی ہے' اس لیے کہ یہ تعامل صحابہؓ اور سلف صالحین سے ثابت ہے۔

(۲) بیعت اصلاً اسلامی حکومت وحکمران کے لیے ہے' لیکن جب اسلامی حکومت یا اسلامی شرائط پر اترنے والا حکمران موجود نہ ہو تو پھر عدم وجود کی صورت میں اقامت دین کی جدوجہد کرنے والی جماعتوں اور اسلامی تحریکوں کے لیے حالات اور ظروف کے مطابق مذکورہ بیعتوں میں سے کسی ایک پر عمل کرنا مندوب' واجب اور فرض ہو جاتا ہے۔

(۳) بیعت سے متعلق اختلاف کی حدود صرف لفظی اختلاف کی حد تک ہیں' معنوی اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اور جب معنوی اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں تو پھر اس صورت میں عمل کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ کیونکہ قاعدۂ اصولیہ ہے کہ تمام عقود میں اصل اعتبار مقاصد اور معانی کا ہوگا' الفاظ اور کلام کی ترکیبوں اور عبارت کا نہ ہوگا' یعنی عقود کی تمام اقسام میں ان کے معانی مقصودہ کا اعتبار کرتے ہوئے ان کے مطابق عمل ہوگا' الفاظ کا تغیر وتبدل ان کو ان کے مقاصد شرعیہ سے علیحدہ نہ کر سکے گا۔(۸۴)

(۴) بیعت اصل مقصد نہیں ہے' بلکہ ایک وسیلہ ہے اور اسلامی نظام کے قیام کے لیے جتنے بھی جائز وسائل درکار ہوں ان کو استعمال کرنے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے' لہٰذا بیعت ایک وسیلہ ہے نہ کہ مقصد' اس

لیے جائز ہے۔

(۵) اگر بیعت ایک جائز کام کے لیے ہو تو وہ بیعت جائز ہے اور اگر بیعت ناجائز کام کے لیے ہو تو وہ ناجائز ہے' خواہ ایک جماعت کے لیے ہو یا امام المسلمین (خلیفہ) کے لیے' اس لیے کہ ارشادِ نبویؐ ہے: ((لاَ طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ))اور((وَالطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوْفِ))واللہ اعلم بالصواب۔

بعض شبہات اور اُن کا ازالہ

شبہ ۱ : کیا مفضول کو افضل پر امیر مقرر کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ افضل کی موجودگی میں مفضول کو امیر مقرر کرنا جائز نہیں ہے' جبکہ ایسا کہنا درست نہیں ہے' کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے مرض الوفات میں حضرت اسامہ بن زید i کی سرکردگی میں ایک لشکر' جس میں کبار صحابۂ مہاجرین وانصار j موجود تھے' روم کی طرف بھیجنے کا حکم فرمایا۔ بخاری شریف میں اس کی تفصیل اس طرح ہے:

عن عبد اللّٰه بن عمر انَّ رَسول اللّٰهِ ﷺ بعث بعثا امر علیهم اسامة بن زید فطعن الناس فی امارته فقام رسول اللّٰه ﷺ فقال: ((ان تطعنوا فی امارته فقد کنتم تطعنون فی امارة اَبِیْهِ من قبل وایم اللّٰه ان کان لخلیقا للامارة وان کان لمن احب الناس الیَّ وهذا لمن احب الناس الیَّ بعده))(۸۳)

''حضرت عبداللہ بن عمر i سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر تیار کیا اور اس پر اسامہ بن زید کو امیر بنایا تو لوگوں نے ان کی امارت پر طعن کیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے اور فرمایا: ''اگر تم ان کی امارت پر طعن کرتے ہو تو تم تو ان کے باپ (زیدؓ) کی امارت پر بھی طعن کیا کرتے تھے' حالانکہ خدا کی قسم! وہ امارت کے لائق تھے اور وہ میرے نزدیک سب لوگوں سے زیادہ محبوب تھے اور یہ (اسامہ) ان کے بعد میرے نزدیک سب لوگوں سے زیادہ محبوب ہے''۔

حدیث اسامہؓ سے معلوم ہوا کہ چھوٹے کو بڑوں پر اور مفضول کو افضل پر امیر بنانا جائز ہے' بشرطیکہ اس میں اہلیت ہو۔ چنانچہ حدیث مذکور کے تحت ملا علی قاریؒ لکھتے ہیں:

قال بعض المحققین فیه جواز امارة المولیٰ وتولیة الصغار علی الکبار والمفضول علی الفاضل (۸۴)

''بعض محققین نے فرمایا ہے کہ اس حدیث میں غلام کی امارت اور چھوٹوں کی بڑوں پر اور مفضول کی فاضل پر تولیت وامارت کا جواز ہے''۔

جب حضرت اسامہ h کو رسول اللہ ﷺ نے امیر لشکر بنایا تو ان کی عمر تقریباً ۱۹ سال تھی۔ یہ لشکرِ

اسامہؓ دراصل حضرت زید بن حارثہؓ کے انتقال کے بعد ان کے قائم مقام حضرت اسامہؓ کو سپہ سالار بنا کر تیار کیا گیا تھا۔ چنانچہ فتح الباری میں ہے کہ: **دعا اسامة فقال سر الٰی موضع مقتل ابیکَ** نبی اکرم ﷺ نے حضرت اسامہؓ کو بلا کر فرمایا کہ اپنے والد (حضرت زید) کے مقتل کی طرف جاؤ''۔

اب سوچنے اور غور کرنے کی بات ہے کہ اغیار تو تمام شعبوں میں الگ الگ اور خاص خاص نگران مقرر کریں اور ہر ہر شعبہ و محکمہ کے محکومین کو اس معین شخصیت کی اطاعت کا پابند بنائیں اور ہم لوگ اپنے پیغمبر ﷺ کے اس ارشادِ عالی کے متبع نہ ہوں جس میں فرمایا گیا: ((اَلَا کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ)) ''کان لگا کر سن لو! تم سب نگران ہو اور اپنی رعیت اور ماتحتوں کے بارے میں جواب دہ ہو''۔ اس ارشادِ عالی نے ہر صاحب امر کو حاکم اور نگران و ذمہ دار بنا دیا۔ نیز حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاِنِ اسْتُعْمِلَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ حَبْشِیٌّ کَاَنَّ رَاْسَہٗ زَبِیْبَۃٌ))[۸۵]

''سنو اور اطاعت کرو اگرچہ حبشی غلام جس کا سر کشمش جیسا ہو تم پر حاکم بنا دیا جائے''۔

اس تشبیہ کے ذریعے بتلا دیا گیا کہ امیر و ذمہ دارِ اعلیٰ میں کچھ ناگواری کی چیزیں بھی ہوں تب بھی اس کی اطاعت اور ماتحتی میں رہنا ضروری ہے' مخالفت اختیار کرنے کا حق نہیں ہے۔

شبہ ۲: اپنے عزیز و قریب اور معتمد کو کوئی منصب دیا جا سکتا ہے یا نہیں؟

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ امارتِ عظمیٰ ہو یا صغریٰ' اپنے عزیزوں کو کوئی منصب دینا جائز نہیں ہے' جبکہ یہ خیال درست نہیں۔ بشرطِ صلاحیت عزیز و معتمد کو منصب دیا جا سکتا ہے۔ اپنے کسی عزیز کو اُس کی صلاحیت کی بنیاد پر کوئی منصب دینے سے وہ اس کے لیے قوت کا سبب بنتا ہے' لہٰذا یہ بھی اس بات کے جواز پر ایک دلیل ہے۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ d نے اللہ تعالیٰ سے اپنے بھائی ہارون d کو وزیر بنانے کی درخواست میں یہی وجہ بیان فرمائی:

﴿وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِی ۝ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِیْ ۝﴾ (طٰہٰ)

''اور میرے لیے میرے اپنے کنبے سے ایک وزیر مقرر کر دے۔ ہارون' جو میرا بھائی ہے' اُس کے ذریعے سے میری کمر مضبوط کر''۔

اس آیت کی تشریح میں مولانا محمد سلیم اللہ خان شیروانی m لکھتے ہیں:

''اس آیت میں اپنے اہل میں سے اپنا معاون مانگنے کی درخواست ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مستحسن امر ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ اپنے اھل کے تعاون و مدد کرنے میں ایک طبعی الفت و لگاؤ ہوتا ہے' وہ اپنے اہل کے بقیہ کام کو بڑی خوش اسلوبی' دلسوزی اور حوصلہ مندی سے بڑھا سکتا ہے۔ اس لیے حق تعالیٰ نے ان کی درخواست کو قبول فرمایا: ﴿قَالَ قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَکَ

یٰمُوْسٰی﴾(طٰہٰ) اے موسیٰ تمہاری درخواست قبول کی گئی''۔مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات بالصراحت واضح ہوگئی کہ امیر کو اعانت کے لیے اپنے کسی اہل کی درخواست کرنا یا خود کو متعین کرنا خلافِ اولیٰ نہیں بلکہ عین قرین مصلحت وحکمت ہے اور حسن انتظام کے نقطۂ نظر سے احسن طریق میں سے ہے' کیونکہ **الولد سر لابیه** (بیٹا باپ کا بھیدی ہوتا ہے) اور **صاحب البیت ادریٰ بما فی بیته** کی رو سے گھر والا گھر کی چیزوں سے خوب واقف ہوتا ہے' لہٰذا ایسی صورت میں اقرباء نوازی اور کنبہ پروری سمجھنا اور اعتراض کرنا کم علمی کی دلیل ہے''۔(۸۶)

حضرت زکریا d نے بھی جو اولاد سے محروم تھے' اپنا وارث بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے اولاد کی درخواست کی:

﴿رَبِّ هَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ ذُرِّیَّةً طَیِّبَةً اِنَّکَ سَمِیْعُ الدُّعَاءِ﴾ (آل عمران)

''اے میرے ربّ! مجھے اپنے پاس (اپنی قدرت) سے پاک اولاد عطا فرما۔ بے شک تو ہی دعا کا سننے والا ہے''۔

ایک اور جگہ ان کی دعا یوں نقل ہوئی ہے:

﴿رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ﴾ (الانبیاء)

''اے میرے ربّ! مجھے تنہا نہ چھوڑ' اور تو بہترین وارث ہے''۔

امام رازی m فرماتے ہیں:

واحب (زکریا) من یونسه ویقویه علی امر دینه ودنیاه ویکون قائما مقامه بعد موته فدعا اللّٰه تعالی دعاء مخلص عارف(۸۷)

''اور حضرت زکریا d نے ایسا وارث چاہا جو اُن کے لیے مونس ہو' اور انہیں دینی اور دُنیوی معاملے میں تقویت دے اور ان کی وفات کے بعد اُن کا قائم مقام ہو جائے' لہٰذا اللہ تعالیٰ سے مخلص عارف کی طرح دعا کی۔''

اس طرح حضرت ابراہیم d کو جب حق تعالیٰ نے امام بنانے کی خوشخبری سنائی: ﴿اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ ''میں یقیناً تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں'' تو حضرت ابراہیم d نے درخواست پیش کی: ﴿وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ﴾ ''اور میری اولاد میں سے بھی'' تو ارشاد ہوا: ﴿لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ﴾ (البقرۃ) ''میرا وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا''۔اس آیت کے تحت بیضاوی شریف میں ہے: ''**اجابة من ملتمسه وتنبیه**'' یعنی ان کی درخواست کی قبولیت بھی ہے اور (قبولیت کی شرط پر) تنبیہ بھی ہے''۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منصب امامت ونبوت ان کی اولاد میں ہی رہے گا بشرطیکہ کوئی مانع نہ ہو۔ چنانچہ دوسری آیت میں صراحتاً اس کا ذکر ہے: ﴿وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِ النُّبُوَّةَ وَالْکِتٰبَ﴾ (العنکبوت) ''اور ہم نے ان (ابراہیم d) کی اولاد میں نبوت اور کتاب کو طے کر دیا''۔اسی سبب سے نسلاً بعد نسل

انہی کی اولاد میں نبوت وملوکیت چلتی رہی۔

شبہ ۳: کیا اولوالامر کے معنی صرف سلاطین، حکام یا علماء تک مخصوص ہیں؟

ایک اور شبہ جو اہل علم کے ہاں بکثرت پایا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ اولی الامر کے معنی صرف سلاطین، حکام یا علماء تک مخصوص ہیں۔ تو آیئے کہ اب ذرا اولی الامر کے مفہوم کو سمجھیں کہ وہ کون لوگ ہیں۔ قرآن پاک میں حق تعالیٰ نے اپنی اور اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کے ساتھ اولی الامر کی اطاعت کا بھی حکم فرمایا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ (النساء:۵۹)

''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے میں سے اولی الامر کی''۔

اس آیت شریف میں صاف طور پر اولی الامر کی اطاعت کا حکم ہے، اس لیے اولوالامر کا مصداق جاننا بھی ضروری ہے۔ ''امر'' ہر مہتم بالشان قول وفعل کو کہتے ہیں اور یہ لفظ حکم کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اولی عربی زبان میں جمع کے لیے آتا ہے اس لیے اولی الامر کے معنی ''حکم والے'' ہوئے۔ اس لفظ کے معنی سے بھی ظاہر ہے کہ یہ لفظ صرف حکام وسلاطین کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ اس میں عموم وشمول ہے، جیسا کہ ذیل کی کتب تفسیر سے معلوم ہوتا ہے۔ صاحب انوار التنزیل فرماتے ہیں:

(اولی الامر) یرید بهم امراء المسلمین فی عهد رسول اللهﷺ وبعده ویندرج فیهم الخلفاء والقضاة وامراء السریة و قیل علماء الشرع(۸۸)

''اولی الامر سے عہد نبوی اور بعد کے امراء مسلمین مراد ہیں اور اس میں خلفاء، قاضیان، امراءِ لشکر سب داخل ہیں اور کہا گیا ہے کہ علماء شرع بھی اس میں داخل ہیں۔''

تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ:

والظاهر انها (اية اولی الامر) عامة فی کل اولی الامر من الامراء والعلماء(۸۹)

''اور ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت امراء اور علماء وغیرہ ہر حکم والے کے لیے ہے''۔

تفسیر خازن میں ہے:

قال الزجاج واولی الامر من یقوم شان المسلمین فی امر دینهم وجمیع ما ادّی الیه صلاحهم(۹۰)

''اولی الامر وہ تمام اشخاص ہیں جو مسلمانوں کے دینی امور اور ان کی صلاح کی چیزوں کے قیم ومنتظم ہوں۔''

مندرجہ بالا تفاسیر سے ظاہر وباہر ہے کہ اولی الامر سے مراد صرف حکام یا سلاطین ہی نہیں ہیں بلکہ اس کا مفہوم بہت عام ہے۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا سہارنپوریؒ نے ''الابواب والتراجم'' میں اولی الامر کی مراد میں

علامہ عینی سے مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد آخری قول اس کے عام ہونے کا نقل فرمایا ہے اور اسی کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام بخاریؒ بھی اسی رجحان کی طرف مائل ہوئے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

الحادی عشر عام فی کل من ولی امر شیءٍ وھو الصحیح والیه مال البخاری بقوله ذوی الامر(۹۱)

''گیارہواں قول یہ ہے کہ یہ لفظ ہر اُس شخص کے لیے عام ہے جو کسی امر کا والی ہو اور یہی صحیح ہے' اسی کی طرف امام بخاریؒ مائل ہوئے ہیں۔''

نیز تفسیرات احمدیہ مؤلفہ ملا جیونؒ میں ہے:

والحق ان المراد به کل اولی الحکم اماما کان او امیرًا سلطانا کان او حاکمًا عالما کان او مجتهدًا قاضیا کان او مفتیا علی حسب مراتب التابع والمتبوع لان النص مطلقٌ فلا یقید من غیر دلیل الخصوص(۹۲)

''اور حق بات یہ ہے کہ اولی الامر سے ہر صاحب حکم مراد ہے خواہ امام ہو یا امیر' سلطان ہو یا حاکم' عالم ہو یا مجتہد' قاضی ہو یا مفتی' تابع اور متبوع کے مراتب کے اعتبار سے (سب مراد ہیں)' اس لیے کہ نص (قرآنی) مطلق ہے' لہٰذا اس کو بلا دلیل کے مقید نہیں کیا جا سکتا۔''

نیز احادیث ذیل سے بھی اس کا بخوبی پتا چلتا ہے کہ امیر اور اولی الامر کا مفہوم شریعت کی اصطلاح میں عام ہے۔ حضرت ابوسعید خدری h روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِذَا کَانَ ثَلَاثَةٌ فِیْ سَفَرٍ فَلْیُؤَمِّرُوْا اَحَدَھُمْ)) (۹۳)

''جب تین آدمی سفر میں ہوں تو اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں۔''

(یہاں تین آدمیوں کا ذکر اس لیے فرمایا کہ اس زمانے میں امن نہ تھا اور آپ ﷺ نے ایک یا دو آدمیوں کو سفر کرنے سے منع فرما دیا تھا۔ اب اس کا وجوب تو ختم ہو گیا ہے استحباب باقی ہے) اس حدیث شریف سے واضح ہو گیا کہ امیر سے مراد صرف سلطان یا حاکم نہیں ہے' بلکہ اس میں بہت عموم ہے۔ حتیٰ کہ سفر کے رفقاء کو بھی یہ حکم ہے کہ اپنے کسی رفیق کو امیر بنا کر اس کی اطاعت کو لازم کرلیں' کیونکہ عقل سلیم کا بھی تقاضا ہے کہ مراد کار کسی شخص واحد پر ہو۔ حضرت ابن عمر i سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((اَلَا کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِهٖ ' فَالْاِمَامُ الَّذِیْ عَلَی النَّاسِ رَاعٍ وَھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِهٖ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰی اَھْلِ بَیْتِهٖ وَھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِهٖ وَالْمَرْاَةُ رَاعِیَةٌ فِیْ بَیْتِ زَوْجِھَا وَوَلَدِهٖ وَھِیَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْھُمْ وَعَبْدُ الرَّجُلِ رَاعٍ عَلٰی مَالِ سَیِّدِهٖ وَھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْهُ ' اَلَا فَکُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِهٖ)) (۹۴)

''غور سے سنو! تم سب کے سب راعی ہو اور تم سب سے اپنی رعیت کے متعلق سوال ہوگا۔ پس

لوگوں کا امام اُن کا نگہبان ہے اور اس سے اپنے ماتحتوں کے بارے میں سوال ہوگا۔ اور آدمی اپنے گھر والوں پر نگہبان ہے اور اس سے اپنی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔ اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی نگہبان ہے اور اس سے ان کے متعلق سوال ہوگا۔ اور آدمی کا غلام اپنے آقا کے مال کا نگہبان ہے اور اس سے اس کے متعلق سوال ہوگا۔ خوب یاد رکھو کہ تم میں ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا''۔

اس حدیث شریف میں رعیت کے لفظ سے معلوم ہوا کہ ہر شخص اپنے ماتحت کا امیر ہے۔

مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں یہ بات بالبداہت والصراحت ثابت ہوگئی کہ لفظ امیر ہر اُس شخص پر جس کے کچھ ماتحت ہوں، شرعی طور پر مستعمل ہوا ہے۔ اس کی اطاعت کا شریعت میں حکم دیا گیا ہے لہٰذا اس کی اطاعت واجب ہے۔

مولانا عبدالحی صاحب کے شاگردِ رشید مولانا فتح محمد اپنی معرکۃ الآراء تصنیف ''خلاصۃ التفاسیر'' میں اولی الامر کے متعلق مختلف مرادوں کا ذکر فرما کر بیان کرتے ہیں:

''اولی الامر سے عام مراد لی جائے، یعنی ہر کام میں اس کا حاکم ومختار اولی الامر ہے تو ان تمام صورتوں کو بلاتکلف شامل ہے جیسا کہ مسلم و بخاری نے روایت کیا کہ فرمایا: اَلَا کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ ''تم سب چرواہے (نگران) ہو اور تم سب سے اپنی رعیت کے متعلق سوال ہوگا'' اور فرمایا کہ امام رعیت کا راعی ہے اور زوج زوجہ کا اور مرد اپنے گھر والوں کا اور عورت اپنے شوہر کے مال وعیال میں اور غلام اپنے مولا کے مال میں راعی اور ذمہ دار ہے۔ اس حدیث سے صاف ثابت ہے کہ داروغہ اپنے ماتحتوں میں اور آقا اپنے نوکروں میں اور ہر شخص اپنے متعلقین کے حق میں آمر (امیر) ہے اور یہ باز پرس جو اُس کے ذمہ لازمی کی گئی ہے، بالضرورت چاہیے کہ وہ لوگ اس کے مطیع ہوں۔ پس ایسی تمام صورتوں میں بقدر قوت وحیثیت اطاعت لازم ہوگی''۔ (۹۵)

امام غزالی اس حدیث کی شرح میں کہ ''سفر میں جب تین آدمی ہوں تو اپنے میں سے ایک کو امیر بنا لیں'' ارشاد فرماتے ہیں: ''اس واسطے کہ سفر میں رائیں مختلف ہوتی ہیں اور جو کام ایک شخص سے متعلق نہ ہوگا وہ تباہ ہو جائے گا''۔ (۹۶)

یہاں تک کے بیان سے بالصراحت یہ امر ثابت ہو گیا کہ اولی الامر کو صرف سلاطین وحکام میں منحصر ومقید سمجھ لینا اور دیگر اولی الامر کو نظر انداز کرنا صحیح نہیں ہوسکتا۔

شبہ ۴: کیا امیر مشورہ کا پابند ہے؟

ایک شبہ یہ بھی ہے کہ امیر مشورہ کا پابند ہے اور کثرت رائے کی صورت میں امیر کو نفاذِ امر کا اختیار نہیں ہے۔ اس شبہ کے ازالے کے لیے ضروری ہے کہ اس پر تفصیلی گفتگو کی جائے، تاکہ اصل موضوع واضح

ہو جائے۔ مشورہ، مشاورت، شوریٰ تینوں الفاظ مترادف اور ہم معنی ہیں جن کے معنی مختلف آراء معلوم کرنا ہے اور رائے دینے والوں کا کام صرف رائے دینا ہے۔ رہا اس کا نفاذ کرنا یا اس پر عمل کرانا، تو یہ ان کا کام نہیں، یہ ان کے دائرۂ عمل سے بالکل باہر ایک الگ چیز ہے۔ یعنی مشورہ، مشاورت اور شوریٰ کی حقیقت کسی امر میں صرف مختلف آراء معلوم کرنا ہے اور مشورہ دینے والوں کا کام صرف اپنی اپنی آراء اس امر کے بارے میں ظاہر کر دینا ہے، لیکن ان آراء میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا یا ان سب آراء کو چھوڑ کر اپنی رائے پر عمل اور اس کو نافذ کرنے کا حق صرف اولی الامر یعنی امیر کو ہے، خواہ وہ امیر یا حاکم گھر کا ہو جیسے والد، یا اقامت نماز کا ہو یعنی امام، یا مدرسہ کا ہو یعنی مہتمم، یا حج کرانے کا ہو یعنی امیر الحج، یا ملک کا ہو یعنی سلطان، یا شہر کا ہو یعنی عامل (کلکٹر)، یا لشکر کا ہو یعنی سپہ سالار (کمانڈر)، یا کچہری کا ہو یعنی قاضی (جج) یا جماعت کار ہبر و لیڈر ہو وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ دُنیوی و ملکی نظام قائم کرنے کے لیے ہر ہر محکمہ و شعبہ میں الگ الگ ذمہ دار و امیر ہوتا ہے اور ان کے ماتحت ان کے تابع و مطیع ہوتے ہیں، کیونکہ اس کے بغیر نظامِ ملکی و دُنیوی درہم برہم اور تباہ ہو جاتا ہے۔ تو جب ملکی نظام و انتظام ہر ہر شعبے و محکمے کے الگ الگ متعین امیر کی اطاعت کے بغیر نہیں چل سکتا تو دین کا معاملہ بھی اسی طرح سمجھنا چاہیے۔ بہر حال مشورہ نافذ کرنے کا حق امیر کو ہے یا مشیروں کو؟ درست بات یہ ہے کہ امیر کے لیے مشورہ لینا صرف امر مستحسن ہے۔ نیز مشیرین کا کام اس کو مشورہ دینا اور اپنی رائے ظاہر کر دینا ہے۔ اب اگر امیر اُن کے مشورے پر عمل کرے تو اس کو عامل بالمشورہ کہنا درست ہے، لیکن اگر مشیرین کے مشورہ پر عمل نہ بھی کرے تب بھی اسے عامل بالمشورہ لازماً کہا جائے گا، کیونکہ مشیروں کے مشوروں کے ساتھ اس کا بھی ایک مشورہ شامل تھا، اس نے اپنے مشورہ پر عمل کر لیا۔ پھر اگر مشیروں کے مشورہ پر عمل کرے تو اس کو یہ اختیار ہے کہ اکثریت کو ترجیح دے یا اقلیت کو، کیونکہ وہ امیر ہے اور امیر با اختیار ہوتا ہے۔ اور مشیر واحد ہو یا جماعت وہ صرف مشورہ دینے والے ہیں، با اختیار نہیں ہیں، جس کی وضاحت مختلف تفاسیر میں موجود ہے۔ اس کی چند مثالیں ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں:

(۱) **فَاِذَا عَزَمْتَ (ای اذا عقدت قلبک علی الفعل وامضائیه بعد المشورة)**[۹۷] ''پس جب آپ عزم کر لیں، یعنی مشورہ کے بعد اس کام کے اجراء اور نفاذ پر آپ اپنے دل میں پختہ ارادہ کر لیں''۔

(۲) **فَاِذَا عَزَمْتَ (علی امضاء ما تريد بعد المشاورة فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (ثقه به لا بالمشاورة)**[۹۸] ''پس مشورہ کے بعد آپ نے جس چیز کا ارادہ کیا ہے اس کے جاری کرنے کا جب آپ عزم کر لیں تو مشورے پر نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیجیے''۔

(۳) **فَاِذَا عَزَمْتَ (فاذا قطعت الرأی علی شیء بعد الشوریٰ)**[۹۹] ''پس جب آپ عزم کر لیں، یعنی جب آپ کسی شے پر بعد مشورہ کے قطعی رائے قائم کر لیں''۔

(۴) **فَاِذَا عَزَمْتَ علی شیء بعد المشورۃ**[۱۰۰] ''جب آپ کسی چیز کا مشورہ کے بعد عزم کرلیں''۔

(۵) **فاذا وطنت نفسک علی شیء بعد الشوریٰ**[۱۰۱] ''جب آپ مشورہ کے بعد اپنی طبیعت کو کسی چیز پر جمادیں۔''

(۶) **فَاِذَا عَزَمْتَ ای عقیب المشورۃ علی شیء واطمانت بہ نفسک**[۱۰۲] ''پس جب آپ عزم کرلیں، یعنی مشورہ کے بعد کسی چیز کا عزم کرلیں اور آپ کی طبیعت اس کے ساتھ مطمئن ہوجائے''۔

نیز ''بیان القرآن'' میں اس آیت کی تفسیر میں تحریر ہے:

> ''اور بدستور اِن سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجیے، تاکہ ان کا اس سے اور دوناجی خوش ہو۔ پھر مشورہ لینے کے بعد جب ایک جانب رائے پختہ کرلیں، خواہ وہ ان کے مشورے کے موافق ہو یا مخالف ہو سو خدائے تعالیٰ پر اعتماد کرکے اس کام کو کر ڈالا جائے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے جو خدا تعالیٰ پر اعتماد رکھیں، محبت فرماتے ہیں''۔

آگے فائدہ میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''یہ جو کہا گیا کہ خواہ وہ ان کے مشورہ کے موافق ہو یا مخالف ہو، دلیل اس کی یہ ہے کہ لفظ عزم میں کوئی قید نہیں لگائی اور اس سے معلوم ہوا کہ امور انتظامیہ متعلقہ بالرائے والمشورہ میں کثرتِ رائے کا ضابطہ محض بے اصل ہے، ورنہ یہاں عزم میں یہ قید ہوتی کہ بشرطیکہ آپ کا عزم کثرتِ رائے کے خلاف نہ ہو''۔[۱۰۳]

دیکھئے ان تمام مفسرین نے ایک ہی بات بیان فرمائی ہے کہ مشورے کے بعد آپ جس رائے کو چاہیں اختیار کرلیں، خواہ وہ اقلیت کا مشورہ ہو یا اکثریت کا یا اپنا۔ اگر مشورے کے بعد فیصلہ کثرتِ رائے کے سپرد ہوتا تو **فَاِذَا عَزَمْتَ** کی بجائے جمع کا صیغہ ''**فَاِذَا عَزَمُوْا**'' آتا یا ''**فَاِذَا عَزَمَ اَکْثَرُھُمْ**'' آتا، مگر ایسا نہیں فرمایا، بلکہ واحد مخاطب کا صیغہ ارشاد فرمایا گیا۔ ان تفصیلی بیانات وتفاسیر سے ثابت ہوگیا کہ امیر کو ہر طرح کا اختیار ہے، وہ چاہے تو کسی کا مشورہ مان لے اور چاہے تو اپنی رائے پر ہی فیصلہ کرے۔ اس موقف کی مزید تائید احکام القرآن للجصاص کی مندرجہ ذیل عبارت سے ہوتی ہے:

> **وکان رسول اللہ ﷺ اذا شاورھم فاظھروا آراء ھم ارتای معھم وعمل بما اداہ الیہ اجتھادہ**[۱۰۴]
>
> ''رسول اللہ ﷺ جب صحابہ کرام j سے مشورہ فرماتے تھے اور وہ اپنی اپنی آراء ظاہر فرماتے تھے تو آپ بھی ان کے ساتھ رائے ظاہر فرماتے تھے اور جس طرف آپ کا اجتہاد پہنچتا عمل فرماتے۔''

آگے مزید تفصیل بتاتے ہوئے صاحب احکام القرآن فرماتے ہیں:

فجائز حینئذ ان توافق آراء هم رأی النبیﷺ وجائز ان یوافق رأی بعضهم وجائز ان یخالف رأی جمیعهم فیعمل ﷺ حینئذ برأیه (۱۰۵)

خلاصہ یہ کہ رسول اللہﷺ کے لیے مشورہ کی تین صورتیں ہوسکتی تھیں۔ایک یہ کہ مشورہ کے وقت صحابہؓ کی رائے آنحضرتﷺ کی رائے کے موافق ہو۔دوسرے یہ کہ بعض صحابہ کی رائے آپؐ کی رائے کے موافق ہواور تیسری صورت یہ بھی ممکن تھی کہ تمام صحابہؓ کی رائے آپؐ کی رائے کے خلاف ہو۔اکثر و بیشتر آپؐ اپنی رائے پر عمل فرماتے تھے۔الغرض تفاسیر مذکورہ کے ساتھ احکام کی تشریح سے بھی یہ بالکل ثابت ہوگیا کہ نفاذ امر کا اختیار صرف امیر کو ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہمارے ہاں ایک غلط فہمی یہ ہوئی کہ امیر کو مأمور اور مشیروں کو امیر کا درجہ دے دیا گیا ہے اور یہ دستور غیر شرعی ہے۔یہ غیر شرعی چیز بعض اسلامی تحریکوں میں اغیار سے درآمد ہوئی ہے۔اس لیے ضروری ہے کہ اسلامی تحریکوں سے اس کو دور کر کے دستور کو شرعی اصول کے مطابق ہی رکھا جائے۔ایسے غیر شرعی نظام پر ملک کے جمہوری طرزِ حکومت سے استدلال کرنا‘خصوصاً اہل علم کا‘ یہ بڑی حیرت کی بات ہے‘ کیونکہ مندرجہ بالا بیانات سے واضح ہوگیا کہ شرعی نظامِ حکومت میں نہ خالص شخصی حکومت (ڈکٹیٹرشپ) کا جواز ہے نہ مروّجہ جمہوریت کا جواز ہے‘ بلکہ ایک ایسا امیر ہو جو مشورہ سے نہ تو مستغنی ہو اور نہ مشیروں کا تابع ہو‘ کیونکہ شریعت محمدیہؐ میں افراط وتفریط نہیں بلکہ اعتدال اور توسط ہے۔ارشادِ الٰہی ہے:﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾(البقرۃ:۱۴۳) لیکن مروجہ جمہوریت میں فیصلہ اکثریت پر ہوتا ہے اور امیر ان کے تابع ہوتا ہے جو بالکل خلافِ عقل وفطرت ہے۔آپ گھر کی حکومت کو لے لیجیے۔کیا اولاد کثرتِ رائے سے اپنے باپ کی حکم عدولی کرسکتی ہے اور یہ کہہ سکتی ہے کہ ہم کمار ہے ہیں لہٰذا آپ ہمارے نوکر ہیں‘ سبزی گوشت لائیے اور جو ہماری شوریٰ پاس کرے وہ کیجیے؟ ہرگز نہیں‘ کوئی عاقل اس کو تسلیم نہیں کرسکتا‘ کیونکہ باپ حاکم ہے‘ بیوی اور اولاد اس کی رعیت ہے۔سب پر اس حاکم کی اطاعت واحترام واجب ہے۔یہاں تک کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر والد ایک حکم دے اور والدہ دوسرا تو اطاعت والد کی کی جائے گی‘ کیونکہ وہ دونوں کا امیر وحاکم ہے‘ البتہ حسن سلوک میں والدہ مقدم ہے۔اسی طرح حالتِ نماز میں امام اور مقتدی میں اختلاف کی صورت میں امام کی رائے مانی جائے گی خواہ مقتدیوں کی کتنی ہی کثرت ہو۔

(یہ مضمون اِن شاءاللہ العزیز آئندہ اشاعت میں مکمل ہوگا۔اس قسط کے حواشی بھی مضمون کے آخر میں دیے جائیں گے۔)

❁❁❁

تعارف وتبصرہ

(تبصرہ نگار: حافظ ابوعمرو عسکری)

نام کتب : (۱) فضائل دعوت

(۲) دعوتِ دین کون دے؟ (اشاعت اول: ستمبر ۲۰۰۷ء)

(۳) دعوتِ دین کس چیز کی طرف دی جائے؟ (اشاعت اوّل: دسمبر ۲۰۰۷ء)

مؤلف : پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی

ملنے کا پتہ: (۱) مکتبہ قدوسیہ رحمٰن مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

(۲) دارالنور [اسلام آباد راولپنڈی] فون: ۲۱۰۶۴۰۰ ۵۱ ۹۲

عصر حاضر میں ملت اسلامیہ ذلت ونکبت کے جس عہد سے گزر رہی ہے اسلامی تاریخ کے دامن میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ رسول مکرم ﷺ کی پیشین گوئی کے عین مطابق پوری دنیا کی طاغوتی طاقتیں اسلام اور اہل اسلام کو نیست ونابود کرنے کی آرزو لیے عالمِ اسلام پر حملہ آور ہیں۔ یہ حملے عسکری سطح پر بھی ہیں اور فکری سطح پر بھی۔ ایک طرف دنیا کے ہر خطے میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے تو دوسری طرف آزادئ افکار، حقوقِ نسواں اور جمہوریت کے نام پر اہل ایمان کو اسلامی تعلیمات اور مسلم تہذیب وثقافت سے بیگانہ کیا جا رہا ہے۔ انہیں سیاسی سطح پر مغلوب کرنے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے جا رہے ہیں اور معاشی سطح پر محکوم بنانے کے لیے ان کے ہاتھوں میں امدادی فنڈز اور سودی قرضوں کا کشکول تھما دیا گیا ہے۔ وحیٔ ربانی کی جانب رجوع کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اہل کفر کی فتح وکامیابی کا حقیقی سبب ان کی مکارانہ چالیں یا ذرائع ووسائل نہیں، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی کثرتِ تعداد کے باوجود جب سے ان کے دلوں میں حبّ دُنیا اور موت کا خوف پیدا ہو چکا ہے اُس وقت سے اُن کی ذلت و بربادی کا آغاز ہو چکا ہے۔ آج ظاہر ہے کہ توحید ورسالت جیسے بنیادی عقائد پر مسلمانوں کا ایمان متزلزل ہو چکا ہے اور اس میں ضعف وبگاڑ کی بہت سی صورتیں پیدا ہو چکی ہیں۔ اس پستی وخواری سے نجات کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ افرادِ اُمت کے عقائد واعمال میں پیدا ہونے والے وہن وکسل کو دور کر کے پھر سے ان کی قوت وتوانائی بحال کی جائے تاکہ ارشادِ پیغمبرؐ کے مصداق اطراف واکنافِ عالم میں اسلام کا نظام جاری وساری ہو جائے اور انسانی معاشرہ عدل وانصاف سے ہمکنار ہو سکے۔ اس کے لیے ضروری

ہے کہ متبعین محمد مصطفیٰ ﷺ تک پیغامِ احمد مجتبیٰ علیہ التحیۃ والثناء پہنچانے کے لیے اُسوۂ حسنہ کی متابعت میں ''دعوتِ دین'' کا فریضہ سرانجام دیا جائے۔ اسی عظیم فریضے کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے عظیم اسکالر جناب پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی حفظہ اللہ تعالیٰ نے متذکرہ بالا تین قیمتی کتب تصنیف فرمائی ہیں۔

محترم ڈاکٹر صاحب کی شخصیت علمی حلقوں میں محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ علومِ شرعیہ میں گہری ممارست رکھتے ہیں۔ دینی تعلیم کی تکمیل سعودی عرب میں کی اور وہیں کی یونیورسٹیوں میں عرصۂ دراز تک تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ بعد ازاں وطن عزیز کی مشہور یونیورسٹی ''انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد'' میں بطور استاذ تعلیم وتدریس سے وابستہ ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب ایک کامیاب مدرس و معلم کے ساتھ ساتھ مصنف بھی ہیں۔ چنانچہ عربی اور اردو ہر دو زبانوں میں دسیوں کتابیں آپ کے قلم سے ضبطِ تحریر میں آ چکی ہیں۔ آپ عالمِ اسلام کی عبقری شخصیت علامہ احسان الٰہی ظہیر شہیدؒ کے بھائی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا مزاج معلمانہ اور داعیانہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی تحریروں کے موضوعات دعوتی واصلاحی نوعیت کے ہوتے ہیں اور زیرِ تبصرہ تین کتابیں تو براہِ راست ''دعوتِ دین'' کے موضوع پر ہیں۔ ان تین کتابوں کے تعارف اور ان پر تبصرے سے قبل مناسب ہوگا کہ محترم ڈاکٹر صاحب کی کتب میں پائی جانے والی خصوصیات کا بالاختصار تذکرہ کر دیا جائے۔ یہ خصوصیات درج ذیل ہیں:

(۱) موضوعِ کتاب سے متعلقہ بنیادی معلومات قرآن وسنت سے اخذ کی جاتی ہیں۔

(۲) احادیث شریفہ کو ان کے اصلی مراجع سے نقل کیا جاتا ہے اور بخاری ومسلم کے علاوہ دیگر کتب حدیث سے منقولہ احادیث کے متعلق علمائے اُمت کے اقوال ذکر کیے جاتے ہیں تاکہ ان کی صحت وضعف کے تعین میں آسانی رہے۔

(۳) آیاتِ طیبہ اور احادیث کریمہ سے استنباط واستدلال کرتے ہوئے یہ امر ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ یہ استدلال فہم سلف صالحین کے مطابق ہو۔ لہٰذا اس سلسلے میں مفسرین کرام اور شارحین حدیث کے اقوال وارشادات پیش کرنے کا التزام کیا جاتا ہے۔

(۴) تحریر کا اسلوب مناظرانہ ومجادلانہ نہیں ہوتا بلکہ مصلحانہ اور خیر خواہی پر مبنی ہوتا ہے جس سے بات مخاطب کے دل میں اتر جاتی ہے۔

(۵) مندرجاتِ کتاب انتہائی آسان اور عام فہم الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں، لہٰذا متنوع اور کم وبیش فہم علم رکھنے والے افراد یکساں طور پر اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

(۶) کتاب کے آخر میں مصادر ومراجع کی تفصیلی فہرست ذکر کر دی جاتی ہے تاکہ موضوع سے متعلق مزید مطالعہ واستفادہ کے لیے آسانی رہے۔

اب ہم تینوں کتابوں کا الگ الگ تعارف پیش کرتے ہیں:

(۱) فضائل دعوت

''فضائل دعوت'' میں ڈاکٹر صاحب حفظہ اللہ نے دعوتِ دین کی فضیلت اور اہمیت وضرورت کو قرآن کریم اور سنت رسول ﷺ کی روشنی میں اجاگر کیا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں آیاتِ قرآنی' فرموداتِ رسولؐ اور آثارِ سلف کے انبار لگا دیے ہیں۔

فاضل مصنف نے دیباچے کے بعد موضوع سے متعلقہ مختلف گوشوں کو نمایاں کرتے ہوئے بائیس عنوانات قائم کر کے ان کی وضاحت کی ہے' جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

☆ گروہِ رُسل f کا مشن دعوت دین ☆ نبی کریم ﷺ کے پیروکاروں کا شعار دعوت الی اللہ تعالیٰ ☆ دعوت الی اللہ کی فرضیت ☆ بہترین اُمت ہونے کا ایک سبب: دعوت دین ☆ حصولِ کامیابی کی ایک شرط: دعوتِ دین ☆ ارشادِ رسول ﷺ پہنچانے والے کے لیے دعائے مصطفیٰ ﷺ ☆ داعی کے لیے عمل کرنے والے کے برابر اجر ☆ دعوت الی اللہ تعالیٰ کا جہاد ہونا۔

ان تمام عنوانات کے تحت قرآن شریف کی آیات' رسول اکرم ﷺ کے فرامین اور سلف صالحین کے اقوال پڑھ کر دل میں دعوتِ دین کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے اور حصولِ اجر کی خاطر عمل کی ترغیب ملتی ہے۔

(۲) دعوتِ دین کون دے؟

ڈاکٹر صاحب کی دوسری کتاب کا عنوان ہے ''دعوتِ دین کون دے؟'' اس کتاب میں فاضل مؤلف نے اس امر کی خوب وضاحت کی ہے کہ دعوتِ دین تمام اہل اسلام کی ذمہ داری ہے' جس سے اس نظریے کا ردّ ہوتا ہے کہ یہ تو صرف تبلیغی جماعت یا مولویوں کا کام ہے۔ اس سلسلے میں مصنف موصوف نے درج ذیل مباحث کے تحت گفتگو کی ہے۔

مبحث اوّل: دعوت دین کا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہونا۔ اس کے ذیل میں آٹھ نکات پر بحث کی گئی ہے۔

مبحث دوم: دعوتِ دین کی ہر مسلمان کو ترغیب۔

مبحث سوم: قبولِ اسلام کے ساتھ ہی دعوتِ دین کا آغاز۔ اس مبحث میں مختلف صحابہ کرامؓ اور جنات کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ انہوں نے مسلمان ہوتے ہی دعوتِ دین کا آغاز کر دیا تھا۔

مبحث چہارم: دعوتِ دین کی خاطر عام مسلمانوں کی سرگرمیاں۔

مبحث پنجم: دعوتِ دین کی ذمہ داری کے متعلق اقوالِ علماء۔ اس کے تحت پانچ جلیل القدر اہل علم کے اقوال ذکر کیے گئے ہیں۔

مبحث ششم: یہ مبحث 'تنبیہات' کے عنوان سے ہے۔ اس میں فاضل مؤلف نے بعض اہم

مسائل کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً ''عامۃ الناس کا صرف دعوتِ خاصہ دینا''۔ یعنی یہ نہیں کہ ہر شخص دین کے ہر مسئلے پر لیکچر جھاڑنا شروع کر دے' بلکہ انہیں صرف خاص اور معلوم شدہ امور ہی کی دعوت دینی چاہیے۔

علاوہ ازیں یہ بھی بتایا ہے کہ دعوتِ دین دینے والے کو اپنے حدودِ علم میں رہنا چاہیے اور جس چیز سے متعلق علم نہ ہو اُس کے بارے میں گفتگو سے احتراز کرنا چاہیے۔

''دعوتِ دین کس چیز کی طرف دی جائے؟''

یہ محترم ڈاکٹر صاحب کی تیسری کتاب کا عنوان ہے۔ اس میں جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے ''نصابِ دعوت'' پر گفتگو کی گئی ہے۔ عصر حاضر میں بعض دعوتی تنظیموں اور تحریکوں میں یہ رجحان دیکھا گیا ہے کہ دعوت میں کتاب وسنت کے بجائے اپنے اپنے گروہوں اور فرقوں کے نظریات کو پیش کیا جاتا ہے جس سے اُمت میں فرقہ واریت کی روش بڑھتی جا رہی ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے کتاب ہٰذا میں پانچ مباحث کے تحت یہ واضح کیا ہے کہ دعوت خالصتاً توحید ورسالت اور کتاب وسنت کی طرف ہونی چاہیے۔ اس طرح بعض جماعتیں دین وشریعت کے چند مخصوص اعمال وعقائد کی طرف دعوت دیتی ہیں۔ اس کی اصلاح کے لیے فاضل مصنف نے ''موضوعِ دعوت'' کے زیرعنوان اس امر کو بالدلائل اجاگر کیا ہے کہ دعوت پورے دین کی ہونی چاہیے نہ کہ اس کے بعض حصوں کی۔

المختصر تینوں کتابیں انتہائی علمی اور مفید ہیں' جن کا ہر گھر اور لائبریری میں ہونا ضروری ہے' تاکہ اُمت مسلمہ اپنے بھولے ہوئے فریضۂ دعوت کی ادائیگی پر پھر سے کمربستہ ہو جائے اور ملت اسلامیہ اہل کفر کے پنجۂ استبداد سے آزاد ہو کر دوبارہ اپنے عہدِ زریں کی طرف لوٹ سکے۔

آخر میں محترم ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں یہ گزارش ہے کہ ایک اور کتاب تحریر فرمائیں جس کا موضوع ہو: ''دعوتِ دین کیسے دی جائے؟'' اس میں وسائلِ دعوت (تقریر' تحریر اور ذرائع ابلاغ) اور داعی کے اوصاف کی قرآن وسنت اور آثارِ سلف کی روشنی میں تفصیلی وضاحت کی جائے اور پھر ان چاروں کتابوں کو چار ابواب بنا کر ''دعوتِ دین: فضیلت' نصاب' طریق کار'' کے عنوان سے یکجا کر کے شائع کرایا جائے۔ یہ کتاب یقیناً اپنے موضوع پر انسائیکلو پیڈیا ہوگی' جس سے خلق خدا اور داعیانِ کتاب وسنت بطورِ خاص مستفید ہو سکیں گے۔

باری تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کے علم وعمل میں برکت دے اور ہمیں اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

اعتذار: حکمت قرآن کے گزشتہ شمارے (جنوری تا مارچ ۲۰۰۸ء) میں صفحہ ۵۰ پر سہواً یہ بات درج ہوگئی تھی کہ تفسیر مظہری فارسی میں ہے' جبکہ یہ عربی میں ہے۔ قارئین اصلاح فرمالیں۔ [ادارہ]